یا فتاح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرفان

جلد ۲ | بابت ماہ مارچ ۱۹۳۱ء مطابق شوال ۱۳۴۹ھ | نمبر ۳

فہرست مضامین

استفسار

ضروریات دین کے متعلق

ایک فاضل کی تحریر میں مندرجہ ذیل عبارت ضروریات دین کے متعلق رقم ہوئی ہے،

ضروریات مذہب حق سے وہ امور مراد ہیں جو دین اثنا عشری میں بدیہی طور سے تسلیم ہو چکے ہیں اب انکے ثابت کرنے کی ضرورت باقی نہیں ہی پس ہر ایک شیعہ برحق پر اور دین تشیع اختیار کرنے والے پر ان ضروریات کا ماننا لازم ہے ورنہ بصورت انکار اگرچہ ایک ہی ضروری کا انکار ہو دین تشیع سے منکر کا علاقہ نہ کہلائیگا پس اسکو شیعہ سمجھنا غلط ہوگا،

علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے کتاب حق الیقین میں ان دونوں قسم کی ضروریات کو مفصلاً تحریر فرمایا ہے اور بعض بعض بدیہی چیزوں کو اسی کتاب میں متفرق طور سے لکھا ہے، ان ضروریات اسلامیہ و ایمانیہ کا مطالعہ ہر مومن پر لازم ہے، ان ضروریات میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو علمائے متقدمین مثلاً علامہ صدوق محقق شیخ مفید و فاضل مدقق، علم الہدیٰ وغیرہم رضوان اللہ علیہم کے عہد میں بداہۃً مسلم نہیں ہوئی تھیں بلکہ انہیں دلائل سے ثابت کیا جاتا تھا مگر پھر وہی چیزیں آگے چلکر بداہۃً تسلیم ہو گئیں تو ان کے نظری ہونے کے زمانے میں اگر کوئی شخص ان کا منکر ثابت ہو جائے تو وہ دین اسلام سے خارج نہ سمجھا جائیگا اور نہ دین تشیع سے وہ بے تعلق متصور ہوگا،

تبدل نظریت کی مثال عرصۂ دراز سے مذہب شیعہ میں یہ بات بدیہی طور سے ثابت ہو چکی ہے کہ جناب رسالتمآب کے بعد امیر المومنینؑ تمام مخلوقات الٰہیہ سے افضل ہیں لیکن اس افضلیت عامہ کے بدیہی ہونے سے پہلے جو علمائے شیعہ گذر گئے جو صاحبان شریعت انبیاء سے اور بعضے صرف جناب ابراہیمؑ سے حضرت امیرؑ کو افضل نہیں مانتے تھے وہ دین تشیع سے خارج متصور نہیں ہو سکتے ہیں کیونکہ اس وقت تک مسئلہ مذکورہ بدیہی طور سے تسلیم نہیں ہوا تھا کہ وہ علما اس فضیلت علویہ کے انکار سے ضروری مذہب کے منکر ہو جائیں، ہاں جب یہ مذہب حق میں بداہۃً مسلّم ہو چکا ہے تو پھر جو شخص جناب رسالتمآب کو مستثنیٰ کرنے کے بعد آپکے نائب اول امیر المومنینؑ کو ساری مخلوقات الٰہیہ سے افضل نہ سمجھیگا تو البتہ ایک ضروری مذہب کے انکار سے دین حق سے خارج متصور ہوگا اس کا مذہب حق سے کوئی علاقہ نہ سمجھا جائیگا،،

اس عبارت کو دیکھکر کئی شبہات ہوتے ہیں امید ہے کہ اہل علم حضرات ان شبہات کو حل فرما کر ممنون فرمائینگے اس استفسار سے اب مجادلہ کا افتتاح منظور نہیں ہے بلکہ کشف حقیقت مد نظر ہے،،

اولاً بطور تمہید یہ گذارش ہے کہ اگر کوئی نظری مسئلہ کسی زمانے میں مقام شہرت میں آ جائے تو ایسا شہرت سے ہم اسکو بداہت کے درجہ میں کر معتقد

نہیں بنا سکتے یعنی یہ کلیہ قائم نہیں ہو سکتا کہ ہر مشہور پر عقیدہ رکھنا بھی ضروری ہے اور اس کے منکر کو مورد عذاب الٰہی سمجھنا لازم ہے،

ظاہری مثال یہ ہے کہ سکون ارض کا مسئلہ یونان کہتے کہ نظام بطلیموسی کس قدر دماغوں پر چھایا ہوا تھا۔ اور کس درجہ مشہور تھا حتیٰ اینکہ اسے بدیہی ہی کہہ سکتے ہیں اسلئے کہ زمین کے سکون اور آفتاب کی حرکت کو مشاہدہ کر رہے ہیں لیکن مسئلہ نظری تھا، شہرت و دوام اہمیت کا اسپر کوئی اثر نہ پڑا، اگر اسے ضروری دین یا مذہب میں شمار کر لیا جاتا، (جیسا کہ کیا بھی گیا ہے) تو آج اسکے خلاف لب کشائی کرنے والوں کو صف اسلام سے الگ کرنا پڑتا، اور ظاہر ہے کہ یہ مسلک کسی عاقل کا مسلک نہیں ہو سکتا،

بہر نہج اس پہلو پر نظر کرتے ہوئے ایراد اول یہ ہے، کہ اگر کسی نظری مسئلہ کا کوئی خاص پہلو کسی زمانے میں مشہور بھی ہو جائے تو اس سے اسکی نظریت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کیونکہ نظری مسئلہ وہی ہے جس میں غور و فکر اور دلیل و برہان کی حاجت ہو اور یہ حاجت ہر زمانے میں مسلم ہے اور نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آج جس نقطہ پر خیال جما ہوا ہے کل کو وہ نقطہ بدل جائے ایسی حالت میں مثلاً اپنے اور اپنے امثال کے خیالات کو معیار سمجھکر اسے عقیدہ بنا لینا اور ضروریات دین و مذہب میں داخل کر لینا عجیب و غریب زبردستی ہے ان

اسی زبردستی کا نتیجہ ہے کہ آج ہر ملا اپنے مد مقابل کو ایمان اور اسلام سے خارج کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے کیونکہ اسکے نزدیک حدود اسلام و ایمان اور ہیں اور مد مقابل کے نزدیک اور غرض دین بھی ایک بازیچہ بنا ہوا ہے،

ثانیاً یہ عجیب و غریب فلسفہ ہے کہ کسی مسئلہ کے نظری ہونے کے زمانے میں اگر کوئی شخص اس کا منکر ہو تو وہ دین و مذہب سے خارج نہ ہوگا مگر بعد میں اگر کوئی منکر ہو تو حدود دین و ایمان سے باہر ٹھہرے، یہ تو ایک اچھا خاصہ تمسخر ہے،

واضح رہے کہ جو مسئلہ نظری ہوتا ہے اسمیں اختلاف ہونا کوئی نئی بات نہیں، پس ایک زمانے میں تو مخالف واجب التعظیم قابل مدح و ثنا ہزاروں بہشت عنبر سرشت لیکن دوسرے زمانے میں اس مخالف کا ہم خیال کشتنی، سوختنی اور جہنمی، ماشاءاللہ کتنا دلچسپ فلسفہ ہے خصوصاً ان لوگوں کا جو عدل کو اصول دین میں داخل کرتے ہیں، کوئی عاقل اسکو قبول کرنے کیلئے تیار ہو سکتا ہے، نیز پُر لطف یہ امر ہے کہ خود جناب فاضل کی یہ رائے نظری ہے یا بدیہی، بدیہی ہونیکا دعویٰ قطعاً غلط ہے اور اگر نظری ہے تو کس دلیل پر یہ دعوے قائم کیا گیا ہے کہ ایک خیال ایک زمانے میں اسلامی و ایمانی حدود کے اندر ہے اور دوسرے زمانے میں کفر و الحاد کے دائرے میں شامل ہے،

تبدیل نظریت کی جو مثال رقم فرمائی ہے اسپر بھی ہمارا یہی ایراد ہے کہ آج بھی اگر کوئی شخص انہیں علما کا ہم خیال ہو تو ہم اس کو زیادہ سے زیادہ اس مسئلہ میں خاطی کہیں گے نہ یہ کہ اسکو مذہب سے خارج کرنے بیٹھیں، اور انا من المجرمین منتقمون کا نعرہ بلند کریں استغفر اللہ۔

جو علما پہلے زمانے میں حضرت امیر علیہ السلام کو انبیائے اولوالعزم یا فقط حضرت ابراہیم سے افضل نہیں مانتے تھے وہ بزرگوار، نیز وہ حضرات جو اس زمانے میں بھی ان کے ہم خیال ہوں، ہم انہیں مذہب سے خارج کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے، اگرچہ ہم ان کے ہمخیال نہیں ہیں ہم انہیں اس مسئلہ میں خاطی یا زیادہ سے زیادہ قلیل المعرفۃ کہکر خاموش ہو سکتے ہیں اور بس، باقی اس سے آگے بڑھنا محض طغیان ہے مدارج و معارف ایمانیہ میں کوئی کسی درجہ پر ہے کوئی کسی پر، اگر کوئی مثلاً دوسرے درجے پر ہے تو اس کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ پہلے درجے والے کا کان پکڑ کر قطعاً ایمان سے خارج کرے،

اب ایک دوسرے پہلو پر نظر فرمائیے، فاضل موصوف کی رقم فرمودہ مثال سے واضح ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ مسئلہ علما میں مختلف فیہ تھا کہ بعد رسالتمآب حضرت امیر علیہ السلام آیا کل مخلوقات سے افضل ہیں یا نہیں ہیں، ایک گروہ معتقد تھا کہ ہیں دوسرا گروہ اسکے خلاف تھا، آخر رفتہ رفتہ پہلے خیال والوں کی ترقی ہوئی اور ان کی رائے تمام فرقہ میں مان لی گئی، اسے عقیدہ بنایا گیا، اور اس کے مخالف کو فرقہ سے الگ کرنے کا حکم جاری ہو گیا، جیسا کہ ممدوح نے فرمایا ہے، اب اسپر نظر کرکے کہا جا سکتا ہے کہ ایمان و عرفان کی حیثیت سے اس فرقے نے بتدریج ترقی کی ہے اور اب بھی ہم یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ ترقی بند ہو گئی ہے، اکونسی دلیل اس امر سے مانع ہے کہ آئندہ چلکر وہی رائے دنیا میں پھیل جائے جسے رد کرنے کے لئے فاضل موصوف نے قلم اٹھایا ہے پس انکی مخالفت امروزہ وہی حکم رکھتی ہے جو زمانہ سابق میں ان لوگوں کی جو حضرت امیر کو بعد رسالتمآب تمام مخلوقات الہیہ سے افضل مانتے پر پڑتے تھے اور اسے مخالف اسلام تصور کرتے تھے، آج اس مخالفت کا ذکر صرف کتابوں میں رہگیا ہے یا کوئی اکا دکا ان کا ہم خیال بھی ہو مگر عام طور سے فرقہ کی مخالفت کا مخالف ہے پس اسیطرح آئندہ چلکر جناب کا ذکر بھی ممکن ہے صرف کتابوں میں رہجائے اور اعتقادی حیثیت سے کوئی بھی جناب کا ہم خیال نہ ہو، ہاں یہ ممکن ہے کہ آئندہ نسلوں کے لئے جو آپ کی ہم رائے نہ ہو آج ہی فتوائے کفر جاری کر دیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ فتوی قابل استہزاء و مضحکہ ہوگا، جیسا کہ آج بھی ہے،

غرض ضروریات مذہب کی تشریح میں فاضل مولف بر
سر صواب معلوم نہیں ہوتے اور ممکن ہے کہ میری سمجھ میں
نہ آیا ہو، لہٰذا صاحبان علم اگر اس معمہ کا حل فرمائیں گے
تو بصد شکریہ قبول کیا جائے گا، اسیطرح ممدوح کا
یہ فقرہ بھی کھٹکتا ہے کہ جو شخص جناب رسالتمآب کو
مستثنیٰ کرنے کے بعد آپکے نائب اول امیر المومنین
(علیہ السلام) کو ساری مخلوقات الٰہیہ سے افضل نہ سمجھے گا
الخ اس فقرے میں اول کی قید کس لئے ہے اور اس
قید سے کوئی مفہوم خاص مد نظر رکھا گیا ہے یا یونہی
یہ لفظ قلم سے نکل گیا ہے؟

واضح ہو کہ ضروریات مذہب وہی امور ہیں جو ہر زمانے میں
مسلم رہے ہیں اور کبھی ان میں اختلاف نہیں ہوا مثلاً توحید
و نبوت کے ساتھ امامت کا تسلیم کرنا اس حیثیت کہ جس
طرح نبی کا تقرر منجانب اللہ ہوتا ہے اسیطرح امام کا
یہ امر ضروریات مذہب شیعہ میں داخل ہے اور جو شخص اسکا
قائل ہے وہ بالیقین اصولاً شیعہ ہے، باقی رہے معاملات
امامت ان میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور رہیگا، اور یہ
کچھ معارف امامت پر ہی منحصر نہیں بلکہ معارف نبوت
معارف توحید، معارف قیامت سب میں اختلاف ہے
اور اس اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر قطعیہ
صواب سے دور ہے اور بہت دور،

تاسف یہ ہے کہ اکثر اوقات انہیں معارف میں اختلاف کی
وجہ سے غلغلۂ تکفیر بلند ہوا ہے اور اسی تکفیر کی بنا پر
مختلف فرقے مسلمانوں میں قائم ہوئے ہیں کسی شخص کی
نسبت فوراً یہ کہہ دینا کہ یہ تشیع سے یا اسلام سے الگ
ہے، یعنے کافر ہے، کتنی خطرناک جرأت ہے، پناہ بخدا،
اسی رسالے میں صاحب عین الیقین پر بھی ایراد کیا
گیا ہے کہ مشاہیر علما ان کی تکفیر کر چکے ہیں لیکن جناب
عالی اس تکفیر کا سایہ تو بڑے بڑے اساطین پر پڑ
چکا ہے یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے، اور زمانہ حالیہ
پر اس کا کوئی بھی اثر نہیں علاوہ ازیں یہ بھی معلوم
ہوتا ہے کہ سابقین جو تکفیر کرتے تھے اس میں
نفسانیت کا کوئی شائبہ نہ ہوتا تھا اور وہ اپنی
غلطی پر واقف ہو کر عذر خواہ بھی ہو جاتے تھے،
(یا محسن قد جاءک المسئ یا محسن تیرے پاس خطاکار
آیا ہے) بھی نہیں کی زبان سے نکلتا تھا مگر موجودہ
زمانہ میں یہ بات نہیں ہے، اب ہوا بدلی ہوئی ہے،
اسی کتاب کا ایک فقرہ نقل فرمایا ہے کہ انما شرف
کل موجود بغلبة الواحدة فکل ما هو ابعد
عن الكثرة فهو اكمل (کہ ہر موجود کا شرف
غلبۂ وحدت پر منحصر ہے پس ہر موجود جس قدر کہ
کثرت سے بعید ہوگا اسیقدر کامل ہوگا) یہ بیان
نہایت صاف اور روشن بیان ہے اور ممدوح
فرماتے ہیں کہ عبارت مذکورہ سے معلوم ہو گیا کہ معاذ
اول وہ ہے جس میں کثرت بالکل نہ ہی میں عرض
کرتا ہوں کہ اس فقرے کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے،

علیہ وحدت وجود چیز ہے اور وحدت حقیقیہ دوسری چیز کون حکیم ہے جو سوائے ذات واحد احد کسی اور کی نسبت وحدت حقیقیہ کا مدعی ہو پس جب اصل فقرہ کا ہی مطلب ملحوظ کے ذہن میں نہیں آیا تو اسپر جو کچھ تفریعات ہوئی ہیں سب بیکار ہیں مخلوق اول کا نام بعض عرفا کے کلمات میں جو وحدۃ حقیقیہ آیا ہے ایسی کبھی تاویل کی ہی ضرورت پڑ گئی ہم اسمیں حل ہونا مناسب نہیں سمجھتے امر اول یعنے ضروریات دین کے متعلق اس لئے اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا، کہ اس کا تعلق تمام فرقے سے ہے اور امر ثانی پر اسلئے ہلکی روشنی ڈالی گئی کہ فہم عبارات میں دقتِ نظر سے کام لینا چاہیئے، والسلام

عالمِ سیاست

خیالاتِ پریشان

موجودہ زمانے میں طریقہ ملکداری میں نئی نئی شاخیں نکل رہی ہیں اور ان شاخوں پر نظر کرتے ہوئے پہلا خیال ذہن میں آتا ہے کہ اتنی نوشگافیوں سے کوئی بہت بڑا امر مدنظر ہوگا اور ملکداری کے یہ طریقے بہت کچھ مصالح رعایا پر مبنی ہونگے مگر یہ خیال غلط ہے، کیونکہ حقیقت امر کچھ بہتر نظر نہیں آتی، جو طریقہ بھی ایجاد کیا جائے ہر طریقہ میں یہی روح جلوہ گر ہے کہ حکام کے تعیش اور عیش میں کوئی فرق نہ آئے اور حاکم قوم ہمیشہ دوسروں کو محکوم رکھتے ہوئے ان سے متمتع ہوسکے، پس یہ تمام اقسام فی الحقیقۃ ایک خوشنما جال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، ایسا جال کہ جس میں انسان نما پرندے بآسانی شکار ہوسکیں، یہ امر مسلم و محقق ہے کہ سلطنت اور حکومت کا وجود تمدن کے لئے ضروری ہے، اسلئے کہ مفسدی الامر یعنے جناب انسان پر اگر دنیا میں کسی کا خوف مسلط نہ ہو تو یہ دنیا چند روز میں خون کا دریا بن جائے اور نسل انسان بہت جلد فنا پذیر ہو جائے پس حکومت و سلطنت ہی ایسی چیز ہے جو قیام تمدن انسانی کی ذمہ دار ہے اور اس کی بقا بہت ضروری ہے لیکن اگر خود حکومت کی ہی بنیاد خون ریزیوں سے شروع کی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ سلطنت نوع انسان کا تحفظ نہیں کرسکتی، موجودہ زمانے میں حکومتوں کا نصب العین جہاں تک دیکھا جاتا ہے فقط حکومت ہے یعنے حکومت کے جتنے طریقے بھی ایجاد کئے جاتے ہیں ان کا مقصد سوائے استحکام و استقلال حکومت اور کچھ نہیں ہوتا اسلئے ان کی نگاہ میں عدل کوئی شئے نہیں ہے بلکہ جس موقع پر جو کام دے

جائے وہی عین عدل و انصاف ہے،
حکومت شخصی کا سب سے بڑا عیب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اپنی رائے سے جو چاہتا تھا کر گذرتا تھا، میں اس ایراد سے بہت متعجب ہوا ہوں کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ آج بھی یعنے جمہوری سلطنتیں ہوں یا شوروی (پارلیمنٹری) سب وہی کرتی ہیں جو ان کے جی میں آتا ہے بلکہ مصیبت ایک اور ہے کہ حاکم شخصی کو تو منت و سماجت التجا اور عرض داشت کے ساتھ اس کی رائے سے روکا بھی جا سکتا ہے لیکن جمہوریت میں یہ دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے پابندی قانون کا بہانا ایک ایسا بہانہ ہوتا ہے جس کا کوئی جواب ہی نہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ یہی قانون کی اتنی عزت کرنے والے حکام اپنے وقت پر یہ بھی فرما دیتے ہیں کہ قانون ہماری زبان ہے، آپ لاکھ قانون دکھائیے لیکن یہ بھی کرینگے جو ان کے جی میں آجائیگی، گویا قانون کی پابندی صرف محکوم کے لئے ہے اور یہ بھی ایک بات، حاکم یعنے مختار کو پابندی سے کیا تعلق،

یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید،

اصل خرابی یہاں سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ اشارہ کیا گیا کہ حکومتوں کا نصب العین بدلا ہوا ہے یعنے عقل کی نگاہ میں مقصد حکومت رعایا کی فلاح و بہبودی ہے اور بس لیکن اب معاملہ برعکس ہے، اب رعایا کا وجود حاکم کی خواہشات پورا کرنے کے لئے ہے اور بس، اور اسی بنا پر اگر رعایا کی فلاح و بہبودی میں کہیں سعی بھی کی جائے تو اسکی مثال ایسی ہی ہوتی ہے، جیسے کوئی شخص قربانی کے جانور کو کھلا پلا کر فربہ کرنا چاہتا ہو تا کہ اسکے گوشت سے کام و دہان لذت یاب ہوں اسلئے آپ دیکھیں کہ حکومتوں کو اگر کسی سال آمدنی کم ہو تو گویا یہ ایک مصیبت عظمےٰ ہوتی ہے جو سر پر آ پڑتی ہے اور ہر ممکن طریقے سے اس نقصان کو پورا کرنے کی سعی کی جاتی ہے اور زبردست قوت استدلال سے کام لیکر اس پرانے مقولے پر عمل کیا جاتا ہے کہ

چو استانی از ہر یک جوے سیم
کہ گرد آید ترا ہر روز گنجے

لیکن بدبخت رعایا پر کیا گذرتی ہے کاشتکار کس مصیبت میں مبتلا ہیں، زمینداروں پر کونسی آفت ہے، تجار کن مصائب کا شکار ہیں، اہل صنعت و حرفت کو نان شبینہ بھی میسر آتی ہے یا نہیں ان امور سے غرض کیا، اور اگر کبھی ان امور کا تذکرہ بھی ارباب محفلوں میں آ جائے تو بس وہ تذکرہ ہی ہوا کرتا ہے، باقی عملی حالت میں آنا میسر نہیں ہوا کرتا، یہ تو ظاہری کھلی ہوئی بات ہے کہ موجودہ زمانے کی حکومتیں جس سختی اور تشدد کے ساتھ مالیات کی تحصیل پر متوجہ ہیں اگر اس توجہ کا عشر عشیر بھی

رعایا کی فلاح و بہبودی پر صرف ہوتا ہے،

ایسی حالت میں جبکہ حکومتوں کا نصب العین ہی بدلا ہوا ہو ہم کونسی طرزِ حکومت کو اچھا سمجھیں اور کونسی کو بُرا، بلکہ سرے سے یہ بحث ہی بیکار ہے شخصی ہو، جمہوری ہو، نیم جمہوری ہو، مرکزی ہو، خواہ غیر مرکزی کا ہو، کچھ بھی ہو سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، اور مطلب سب کا یہی ہے کہ کمزور کا خون جہاں تک ہو چوس لیا جائے،

وہ حکومتیں جن کی نگاہ مادہ پرستی تک محدود ہے، ہم ان سے اس سے زیادہ توقع ہی نہیں کر سکتے وہ ہر رنگ میں وہی کریں گی جو انہیں کرنا ہے،

سوراج اور اُس کا خیال

ان گر ایک خیال بالفطرت انسان کے ذہن میں آتا ہے کہ اگر ہماری قوم حکمران ہو، ہمارے اہل وطن کی حکومت ہو تو ضرور ہے کہ ہماری تکالیف اور ہمارے مصائب میں کچھ نہ کچھ کمی ہو جائیگی، یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے اور ہندوستان میں آجکل اس خیال کی عام ہوا چل رہی ہے اور اس خیال کی نشو و نما کی ذمہ دار گورنمنٹ انگلشیہ کی مفاخرانہ حکمت عملی ہے،

انگریزی مدبرین نے اپنے وطن کی محبت کے جوش میں اور اپنی قوم کی پرورش کی خاطر ہندوستان کو بالکل مفاخرانہ نگاہ سے دیکھا، محبت وطن یا پرورش تو پر ہمارے خیال میں کسیکو الزام نہیں دیا جا سکتا، لیکن اس امر سے اگر دوسروں کے حقوق پر نمایاں اثر پڑے بلکہ وہ بڑی حد تک نظر انداز ہو جائیں، تو البتہ یہ امر بہت جلد شورش و غوغا کا سبب بن جایا کرتا ہے

اولاً یہ ایک ضروری امر ہے کہ کسی ملک پر مستقل حکومت کرنے کے لئے حاکم اسی ملک کو اپنا وطن قرار دے، اس توطن سے اس مقام کی محبت اس کے دل میں ہوتی ہے، نیز اختلاط باہمی سے وہاں کے باشندے بھی اس سے مانوس ہو جاتے ہیں مسلمانوں نے جو کئی سو برس تک ہندوستان میں حکومت کی باوجودیکہ ان سلطنتوں میں زمانۂ حالیہ کے سے قانون نظم و نسق وسائل آمد و رفت کچھ بھی موجود نہ تھے، اسکا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ یہیں کے ہو گئے تھے، یہی سرزمین ان کا وطن بن گئی تھی اہل ہند انہیں اجنبی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے اور نہ وہ اجنبی رہے تھے اور باوجود مخالف مذہب باہم مانوس ہو چکے تھے اسی بنا پر انکے خلاف جذبۂ "سوراج" بلند نہ ہوا تھا، اسیطرح اگر مدبرین انگلشیہ ہندوستان کو ایک مستقل حکومت کی حیثیت میں رکھتے، پایہ تخت یہیں قرار دیا جاتا اسی سرزمین کو وطن سمجھا جاتا، تو آج یہ طوفان بپا نہوتا، یہاں مستقل سکونت اختیار کر کے اپنی تہذیب کی بھی اشاعت کر سکتے تھے اپنے ہم قوموں کو بھی فائدہ پہنچا سکتے تھے اور ہندی رعایا کو بھی بہت کچھ فوائد حاصل ہو سکتے تھے لیکن مدبرین نے

اپنی حکمت عملی کا رُخ دوسری ہی جانب رکھا اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہر ہندی سلطنت کو مغائرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے وہ اس حکومت کو غیر حکومت سے تعبیر کرتا ہے اور اسے حکومتِ موجودہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی،

وہ لوگ جو سوراج کے خواہشمند ہیں اب یہ تو خدا کو ہی معلوم ہے کہ سوراج کے زمانے میں ملک کی حالت بہتر ہوگی یا بدتر مگر ہم اتنا ضرور کہتے ہیں کہ ابھی تک سوراج کے نعروں میں بہت کچھ ایک خاص قوم کی حکومت کا راز پنہاں ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "سوراج" کے معنے ابھی تک تو "ہندو سوراج" کے لئے جاتے ہیں "ہندوستانی راج" کے نہیں ہیں اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ فضا بہت کچھ ان کے موافق ہوتی جاتی ہے، اگرچہ مہاتما گاندھی کی تقریروں سے یہ پتہ چلتا ہے، کہ وہ فرقہ وارانہ فساد کو روکنے میں ساعی ہیں لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہا جائیگا کہ موصوف حکومت کے مقابل میں چاہے کسی نقطہ کامیابی پر پہنچ جائیں لیکن ہندو قوم کی ذہنیت موجودہ کو بدلنے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ اس ذہنیت کی کافی طور سے تربیت ہوئی ہے ہو رہی ہے اور کافی کدوکاوش کے ساتھ اسے موجودہ نقطے پر پہنچایا گیا ہے

اگر ہم انصاف سے دیکھیں تو ہمیں اس معاملہ میں ہندوؤں کو کوسنے کا کوئی حق نہیں ہے ہندو قوم نے اپنی مساعی کوششوں سے اپنے آپ کو اس نقطہ پر پہنچایا ہے، ان کے پاس تعلیم ہے، دولت ہے، اتحاد ہے، ایثار ہے، رہنما ہیں نمائندے ہیں، قوت عمل ہے، تجارت ہے، اقتصادیات ہیں، غرض دنیاوی ترقی کے لئے جتنے سامانوں کی ضرورت ہے وہ سب موجود ہیں، لہذا ہمیں کہنا پڑیگا کہ یہ قوم ترقی کی مستحق ہے، حکومت کا استحقاق، اس نے پیدا کر لیا ہے، اور یہ حاکم ہو کر رہیگی اور ہم تو اس بارہ میں مہاتما گاندھی کو نہایت ہی خوش اخلاق سمجھتے ہیں جو وہ مسلمانوں کے مقابل میں اپنے ہم قوموں کو حقوق کا سوال اٹھانے سے روکتے ہیں انہیں ایثار پر آمادہ کرتے ہیں ورنہ ہمارے خیال میں تو مسلمانوں کا اب کوئی حق ہی نہیں ہے کیونکہ ان میں وہ چیزیں ہی نہیں ہیں جو کسی کو مستحق ثابت کیا کرتی ہیں، اکثریت اور اقلیت کا سوال بالکل فضول ہے، ہندو قوم اپنی اکثریت کی وجہ سے موجودہ نقطہ پر نہیں پہنچی بلکہ ان خصائص کی وجہ سے پہنچی ہے جو اس نے پیدا کر لئے ہیں، مسلمان اپنی موجودہ تعداد سے چوگنے بھی ہوں یا اس سے بھی زیادہ ہوں لیکن موجودہ بدنظمی ان میں پائی جائے جب بھی وہ کسی قابل نہیں سمجھے جا سکتے، اس لئے کہ دینی ترقی ہو یا دنیاوی، اتحاد عمل اور اتحاد خیال پر منحصر ہے اور وہی شے مسلمانوں میں مفقود ہے،

یہ بھی کچھ قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی قوم انتہائی نقطہ

تنزل پر نہیں پہنچ یعنی اسوقت تک وہ ترقی کی جانب
قدم نہیں بڑھاتی، معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مسلمانوں کو
اور درجات تنزل طے کرنے کی ضرورت ہے،

اسی ضمن میں اگر طبقہ شیعہ کا بھی ذکر آجائے تو نا
مناسب نہ ہوگا اور مسلمانوں کی حالت اگر بد ہے تو
ان کی بدتر اور اگر پست ہیں تو یہ پست تر، ابھی تو
یہ بیچارے اپنے پر نوحہ خوانی کر رہے ہیں کہ ہمیں علما کی
بدولت یہ روز بد نصیب ہوا، دیکھیں یہ نوحہ خوانی
کب تک رہیگی، ابھی تک اس نوحہ خوانی کا نتیجہ یہ
نکلا ہے کہ اگر اس قوم میں یکجہتی اور اتحاد کے
آثار کچھ باقی بھی تھے، وہ بھی جاتے رہے،

ان نوحہ خوانوں کی نسبت میرے ایک تعلیمیافتہ
دوست کا خیال ہے، کہ ان حضرات کا مقصد اس
واویلا سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ خود
مسند ہمای پر متمکن ہوں اور پھر جو کچھ دل میں آئے
کریں، جیسا کہ ان کے افعال و اطوار سے نمایاں ہو
رہا ہے، جو چیز انہیں دوسروں میں بری معلوم ہوتی
ہے وہ خود ان میں موجود ہے اور اپنے لیے اسے
مستحسن سمجھ رہے ہیں،

اب اس فرقہ کی بھی تمنا ہے کہ میدان سیاست کے
پانچویں سواروں میں اس کا نام بھی درج ہوجائے
مگر جن اصولوں پر وہ اپنی نئی سیاست کی بنیاد رکھ
رہا ہے، وہی غلط ہیں، پس کامیابی معلوم،

اخیر میں پھر یہ دوہرانا پڑتا ہے کہ جس نئی حکومت کا
خواب اہل ہند دیکھ رہے ہیں، اگر اس کا مقصد
صرف یہ ہے کہ ایک قوم کی حکومت دوسری قوم کی
طرف منتقل ہوجائے، اور گمان غالب ہے کہ ایسا
ہی ہو تو پھر

ہمان آش در کاسہ

اور اگر مقصد عام ملکی بہبودی ہے، تو شاید اسکو
خوش آمدید کہا جا سکے، مگر خدشہ یہ ہے کہ کہیں
موجودہ حالت کو یاد کرکے رونے کی نوبت نہ آئے
مولانا لطف اللہ شاہپوری کے مندرجہ ذیل
اشعار آج کل ہماری حالت کی صحیح تصویر ہیں،

طالعے یار شدم کہ از پے آب
گر روم سوئے بحر بر گردد
ور بدوزخ روم پے آتش
آتش از یخ فسردہ تر گردد
ور بکوہ التماس سنگ کنم
سنگ نایاب چون گہر گردد
این ہمہ حادثات پیش آید
ہر کرا روزگار بر گردد
بہمہ حال شکر باید کرد
کہ مبادا ازیں بتر گردد

فضائلِ علویہ

در پس پردہ نہان بودمی و تو بے بضلالت
حرمتِ ذاتِ تو نشناختہ گفتند خدائی
پس چہ گویند ندانم چو ازان طلعتِ زیبا
پردہ بردارمی و آن گونہ کہ ہستی بنمائی

مبالغہ اور اغراق کی ادبیات میں یہ ایک اعلیٰ مثال ہے جسے سنتے ہی قلب پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے،

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ہندوستان میں بدبخت غالی بہت ہو گئے ہیں جس طرح ممکن ہو انکا استیصال کیا جائے مگر افسوس یہ ہے کہ یہ سعی رائگان جائیگی، اس لئے کہ حامیان ملتِ بیضا وماحیان بدعت ظلما و کفر و غلو شکن حضرات کے ہاتھ میں تلوار تو ہے نہیں، ہاں منہ میں چند لفظ ہیں، مثلاً غالی، مرتد، گمراہ، بے دین، کافر، ملعون، جہنمی وغیرہ اور ان لفظوں کی اب کوئی وقعت نہیں ان لفظوں کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے کہ اب ان میں حلاوت باقی نہ رہی،

ایک عالم ربانی شیخ مرتضیٰ انصاری رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ غالی کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، فرمایا کہ غالی کہتا کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ علی علیہ السلام کو خدا کہتا ہے جواب دیا کہ بیچارہ علی علیہ السلام را خدا نشناختہ،

حقیقتہً غالی کی دماغی حالت نہایت قابل رحم ہے مخلوق کو خالق سمجھ لینا اس سے بڑھکر حماقت اور جہالت کیا ہو گی لیکن اگر آپ صبر و تحمل اور نظر صادقہ کے ساتھ سنیں تو ایک بات کہنی چاہتا ہوں

یا علیؑ مدد

ان میں جانتا ہوں کہ غالی (علیؑ کو خدا کہنے والا) آئمہ علیہم السلام کی زبان سے ملعون کا لقب پائے ہوئے ہے،

حضرات آئمہ علیہم السلام نے ان سے اپنی برأت ظاہر کی ہے اور ہم بھی ان حضرات کے اتباع میں یہی کرتے ہیں، لیکن آپ اب یہ نظر فرمائیے کہ اس بدبخت غالی کا آخری انجام کیا ہونا چاہیئے،

اس سوال کو حل کرنے کے لئے اسی امر پر نظر ڈالئے کہ غالی سے جو یہ جہالت سرزد ہوئی ہے، اس کا مبدء و منشا کیا ہے آیا بغض علوی ہے یا محبت علوی، صورت اول غلط ہے لہذا صورت ثانی صحیح ہو گی، پس اب یہ کوئی عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ محبت کا مرجع بھی وہی قرار دیا جائے جو بغض کا ہوتا ہے اختلاف مبدء کے ساتھ معاد بھی مختلف ہونی چاہیئے اور محب و مبغض کی معاد کا ایک ہونا بے اصول بات ہے،

ان حضرت امیر المومنین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد نظر میں ہے کہ ھلک فی اثنان محب غال ومبغض قال میرے بارے میں دو شخص ہلاک ہوگئے، دوست میرے بارے میں غلو کرنے والا اور دشمن مجھے گھٹانے والا، ان دونوں کے متعلق حضرت نے لفظ ہلاکت استعمال فرمایا ہے لیکن میں یہ عرض کرتا ہوں کہ معنی ہلاکت دونوں میں مشترک ہوتے ہوئے بھی ہر شخص کو اس کی جوہریت کے موافق اس میں سے حصہ پہنچنا چاہیئے،

مثال اور عام فہم مثال یہ ہے کہ آپ کا ایک دشمن ہے ایک دوست دونوں سے ایک فعل ایسا سرزد ہوا جو آپ کے حکم یا آپ کی مرضی کے خلاف ہے لیکن دوست سے فرط محبت میں یہ فعل ظاہر ہوا اور دشمن سے بوجہ دشمنی، آپ کو ملال دونوں کی طرف سے ہوا، لیکن نتائج ملال دونوں کے لئے کبھی یکساں نہ ہونگے آپ دونوں کو سزا دینگے مگر نوعیت سزا میں تفاوت بہر حال رہیگا، اگرچہ سزا کا اطلاق دونوں پر ہوگا، اسی لئے مسلم اصول ہے کہ لفظ کا مفہوم سمجھنے کے لئے مضاف الیہ کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے،

اسلئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ غالی کو جہنم میں ضرور بھیجیں لیکن اتنی تو اسکے ساتھ رعایت کریں جتنی کہ نوشیروان اور حاتم کے لئے بوجہ عدالت وسخاوت کی جاتی ہے آخر محبت علوی کا درجہ ان خصائل حسنہ سے اگر بڑا ہوا نہیں ہے تو مساوی تو ضرور

ایک اور بات بھی سن لیجے کہ میں اور آپ غالی کو کافر کہہ سکتے ہیں اسلئے کہ یہ ہماری اختیاری بات ہے لیکن ہم یہ قدرت نہیں رکھتے کہ ابد الآباد تک آتش جہنم میں بھی محبوس کر دیں، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مدت دراز کی سزاؤں اور تکلیفوں کے بعد ادھر بھی کو نسیم رحمت کا جھونکا گذر جائے، آخر اس محبت کا کچھ تو اثر نمودار ہونا چاہیئے،

یہ کہنا کہ محبت کا لازمہ اطاعت ہے ہر مقام میں اس کلیہ کی صحت مسلم نہیں ہے، بیٹا نافرمان ہوتا ہے مگر باپ کی محبت اس سے سلب نہیں ہو جاتی بلکہ کبھی نہ کبھی اس کا ظہور ہو کر رہتا ہے،

خیر اس امر سے کیا بحث کہ غالی ناری ہے یا ناجی دوزخی ہے یا بہشتی لیکن میں تو اس مصیبت کو محسوس کرتا ہوں کہ بیان فضائل علوی روز بروز خطرے میں آرہا ہے، مدعا یہ ہے کہ جس طرح ہم کہیں اس طرح بیان کرو اور جو نتائج ہم نکالیں وہی نکالو، جو حد ہم قائم کر دیں اس سے ایک انچ بڑھے اور حدود کفر میں داخل ہو گئے، میرے خیال میں اس ارشاد کی تعمیل زمانہ عام میں ناممکن ہے اور ہر تشیع کی روح فضائل علوی ہیں اور ان سے لامحالہ ہر شخص کچھ نہ کچھ نتائج بھی نکالتا ہے ذہن کو روکا نہیں جا سکتا اہل

کے سامنے دیوار کھڑی نہیں کی جاسکتی اور نتائج مخالف طبع سامنے ہی ہوتے ہیں پس اندریں صورت سرے سے اگر ذکر فضائل کو ہی حرام قرار دیدیا جائے تو بہت انسب ہے کیونکہ یہی وہ شے ہے جو غلو کا سرچشمہ ہے اور اس طرح بجائے غلو شکنی کے اگر روح تشیع کا قلع قمع کردیا جائے تو حسنات دنیا و آخرت کے حصول کی کافی امید ہے،

غیر ازشعبدہ سرقا! ان احکام پر ہمیشہ منہی ہے اور ہستی رہیگی اگر فریاد بھی کی جائیگی تو ممدوح سے ہی کی جائے گی اور وہ ہی بلہجہ نیاز کہ

بجرم عشق توام می کشند غوغائیست
تو نیز برسر بام آکہ خوش تماشائیست

اچھا آئیے ہم تو ایک دو حدیثوں پر نظر کرکے لطف اٹھائیں اگر کوئی چڑتا ہے تو چڑے، غصہ میں دو لے زیادہ کھائے گا اور کیا ہوگا،

روی الصدوق طاب ثراہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ قال اعطیت ثلاثا علی مشارکی فیہا واعطی علی ثلاثا لم اشارکہ فیہا فقیل یارسول اللہ ما الثلاث التی شارکک فیہا علی علیہ السلام قال لواء الحمد لی وعلی حاملہ والکوثر لی وعلی ساقیہ والجنۃ والنار لی وعلی قسیمہا واما الثلاث التی اعطی علیؑ ولم اشارکہ فیہا فانہ اعطی شجاعۃ ولم اعط مثلہا واعطی فاطمۃ الزہرا زوجۃ ولم اعط مثلہا واعطی ولدیہ الحسنؑ و والحسین علیہما السلام ولم اعط مثلہما

صدوق علیہ الرحمہ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت رسول صلے اللہ علیہ وآلہ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے تین چیزیں عطا ہوئیں جن میں علی (علیہ السلام) میرا شریک ہے اور علی (علیہ السلام) کو تین چیزیں دی گئیں کہ میں ان میں شریک نہیں ہوں، پوچھا گیا کہ یارسول اللہ وہ کونسی تین چیزیں ہیں جن میں علی (علیہ السلام) آپ کے شریک ہیں فرمایا کہ لواء الحمد میرے لئے ہے اور علیؑ اسکا حامل ہے، کوثر میرے واسطے ہے اور علیؑ اس کا ساقی ہے، جنت و نار میرے لئے ہے اور علیؑ (علیہ السلام) اس کا قاسم ہے، لیکن وہ تین چیزیں جو علی (علیہ السلام) کو دی گئیں اور میں ان میں شریک نہیں ہوں وہ یہ ہیں کہ علیؑ کو شجاعت دی گئی جس کے مثل مجھے نہیں ملی، علیؑ کو فاطمہ زہرا (علیہا السلام) سی زوجہ ملی جس کے مثل مجھے نہیں ملی، اور ان کو حسنؑ و حسینؑ جیسے دو بیٹے ملے اور جن کے مثل مجھے نہیں ملے،

سید نعمت اللہ جزائری علیہ الرحمہ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ شجاعت سے اس مقام پر اسکی عملی حالت اور ممارست حروب مراد لینا چاہئے نہ کہ وہ قوت جس کا مبدء قوت قلب ہے اور

جس سے جنگ میں ثابت قدم رہنے کی جرأت ہوتی گر
اس لئے کہ اس قوت کا حصہ وافر نبی صلے اللہ علیہ
وآلہ کے لئے ہے ان چونکہ حضرت اکمل ور سلطان کی
حیثیت رکھتے تھے لہذا بہ نفیس نفیس مباشر حرب
ہوتے تھے اور علی السلام اس امر کو انجام دیتے تھے
سید علیہ الرحمۃ کا یہ ارشاد فاتبا اس بنا پر ہے کہ اگر
یہ تاویل نہ کیجائے تو حضرت مرتضوی کی مزیت حضرت
رسول اکرم پر لازم آئیگی لیکن اس تاویل کے بعد بھی
یہ خدشہ باقی رہجاتا ہے اسلئے کہ زن و فرزند کی حیثیت
بحال خود باقی رہتی ان کی نسبت شاید یہ کہا جا سکے کہ
ان چیزوں کا فضائل ذاتیہ میں شمار نہیں ہو سکتا،
وروی ایضاً عن عبد اللہ بن مسعود
قال دخلت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ
فقلت یا رسول اللہ ارنی الحق لا نصل الیہ قال
یا عبد اللہ الج المخدع فولجت المخدع وعلی
بن ابیطالب یصلی ویقول فی رکوعہ وسجودہ
اللّٰھم بحق محمد عبدک اغفر للخاطئین من
شیعتی فخرجت حتی اخبر رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہ فسمعتہ یقول اللّٰھم بحق علی ابن
ابیطالب عبدک الا ما غفرت للخاطئین من
امتی قال فاخذنی من ذالک الھلع العظیم
فاوجز النبی صلی اللہ علیہ وآلہ فی صلاتہ و
قال یا ابن مسعود اکفر بعد الایمان فقلت
حاشا وکلا یا رسول اللہ ولکن رأیت علیاً
یسئل اللہ بک ورأیتک تسئل اللہ بہ ولا
اعلم ایکما افضل عند اللہ تعالیٰ فقال
اجلس یا ابن مسعود فجلست بین یدیہ
فقال اعلم ان اللہ خلقنی وعلیاً من نور
عظمتہ قبل ان یخلق اللہ الخلق بالفی
عام اذ لا تسبیح ولا تقدیس ولا تہلیل
ففتق نوری فخلق منہ السموات والارض
وانا واللہ اجل من السموات والارض
وفتق نور علی بن ابیطالب فخلق منہ العرش
والکرسی وعلی واللہ اجل من العرش و
الکرسی وفتق نور الحسن علیہ السلام فخلق
منہ اللوح والقلم والحسن واللہ اجل
من اللوح والقلم وفتق نور الحسین علیہ
السلام وخلق منہ الجنان والحور العین
والحسین علیہ السلام واللہ اجل من
الجنان والحور العین ثم اظلمت المشارق
والمغارب فشکت الملائکۃ الی اللہ تعالیٰ
ان یکشف عنھم تلک الظلمۃ فتکلم اللہ
جل جلالہ بکلمۃ فخلق منہا روحاً ثم
تکلم بکلمۃ فخلق من تلک الکلمۃ الاخری
نوراً فاضاف النور الی تلک الروح و
اقامھما امام العرش فازھرت

المشارق والمغارب نهی فاطمة الزهرا
علیها السلام فلذلک سمیت زهرا
یا بن مسعود اذا کان یوم القیامة یقول
الله جل جلاله لی ولعلی ادخلا الجنة
من شئتما وادخلا النار من شئتما وذالك
قوله تعالى القیا فی جهنم کل کفار عنید
فالکافر من جحد نبوتی والعنید من
جحد ولایة علی ابن ابیطالب"

نیز عبداللہ بن مسعود سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے حق دکھا دیجئے کہ میں داخل بحق ہو جاؤں فرمایا اے عبداللہ حجرے میں چلے جاؤ وہ کہتے ہیں کہ میں حجرے میں داخل ہوا دیکھا کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام نماز پڑھ رہے ہیں اور رکوع و سجود میں کہہ رہے ہیں کہ بار الہا محمد مصطفے (صلے اللہ علیہ و آلہ) اپنے بندے کے حق کا واسطہ میرے خطاکار شیعوں کو بخش دے میں باہر نکلا کہ رسول اللہ کو خبر دوں اب میں نے رسول کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ بار الہا علی ابن ابی طالب جو تیرا بندہ ہے میری امت کے گنہگاروں کو بخش دے، یہ دیکھکر ایک عظیم اضطراب مجھپر طاری ہوا، رسول اللہ نے اپنی نماز کو مختصر کیا اور فرمایا اے ابن مسعود کیا ایمان کے بعد کفر؟ میں نے عرض کیا کہ حاشا وکلا یا رسول اللہ لیکن میں نے علی (علیہ السلام) کو دیکھا کہ وہ آپکے واسطے سے دعا مانگ رہے ہیں اور آپ کو دیکھا کہ ان کے واسطے سے سوال کر رہے ہیں اب میں نہیں جان سکتا کہ عنداللہ آپ دونوں میں سے کون افضل ہے فرمایا اے ابن مسعود بیٹھ جا، میں سامنے بیٹھ گیا اسوقت ارشاد ہوا کہ جان لے کہ مجھے اور علی (علیہ السلام) کو خدا نے اپنے نور عظمت سے پیدا کیا، مخلوق کی خلقت سے دو ہزار برس پہلے جبکہ نہ تسبیح تھی نہ تقدیس و تہلیل پس میرے نور کو شگافتہ کرکے اس سے زمین و آسمان بنائے اور واللہ میں زمین و آسمان سے جلیل تر ہوں اور پھر نور علی کو شگافتہ کیا، اس سے عرش و کرسی خلق فرمائے اور واللہ علی عرش و کرسی سے بزرگتر ہیں، پھر حسن علیہ السلام کے نور کو شگافتہ کیا اور اس سے لوح و قلم خلق فرمائے اور حسن علیہ السلام لوح و قلم سے جلیل تر ہیں، پھر حسین علیہ السلام کے نور کو شگافتہ کیا اور اس سے جنت اور حور العین کو خلق فرمایا اور واللہ حسین علیہ السلام جنت و حور العین سے بزرگتر ہیں، پھر مشارق و مغارب تاریک ہو گئے ملائکہ نے خدا سے اس ظلمت کی شکایت کی کہ اسے بر طرف فرما دیا جائے پس خدا نے ایک کلمہ سے تکلم کیا اور اس سے روح کو خلق فرمایا، پھر دوسرے کلمہ

سے تکلم کیا اور اس سے نور کو خلق فرمایا پس اس نور کو
روح کی طرف اضافہ فرمایا اور اسے عرش کے سامنے کھڑا
کر دیا جس سے مشارق و مغارب چمک اٹھے پس وہ
فاطمہ زہرا ہیں (صلوات اللہ علیہا) اسی لئے ان کا نام
زہرا رکھا گیا۔ اے ابن مسعود جب قیامت کا دن ہوگا
تو خداوند عالم مجھ سے اور علی (علیہ السلام) سے فرمائیگا
کہ تم دونوں جسے چاہو جنت میں داخل کرو اور جسے
چاہو دوزخ میں اور اس قول خداوند عالم "تم دونوں
ہر جبار و عنید کو جہنم میں ڈالدو" میں اسی امر کی طرف
اشارہ ہے پس جو میری نبوت کا انکار کرے وہ
کافر ہے اور جو علیؑ کی ولایت کا منکر جاحد ہو وہ
عنید ہے" اس حدیث میں کتنے معارف پنہاں ہیں
ان کو راسخون فی العلم ہی جان سکتے ہیں کسی دوسرے کی
کیا مجال ہے اجوبہ کشائی کرے صرف چند اشارے
جو ظاہراً معلوم ہوتے ہیں عرض کئے جاتے ہیں۔
(۱) دو نو بزرگواروں کی خلقت مقام عظمت سے ہوئی
اور اسم العظیم کی دو نو بزرگواروں میں جلوہ گری ہے
(۲) رسول اللہ کے نور سے زمین و آسمان کی خلقت ہوئی
ہے اور علیؑ مرتضےٰ کے نور سے عرش و کرسی کی۔ فتق
انوار یعنے نور کو شگافتہ کر کے اس سے کسی چیز کا خلق
کرنا ایک طول و تفصیل کا محتاج ہے مجملاً یوں سمجھئے
کہ ایک بزرگوار ارض و سما کی علت ہیں اور دوسرے
بزرگوار عرش و کرسی کی اور ان انوار کے شگافتہ ہونے کو
فتق (شگافتگی) سے تعبیر کیا گیا ہے)
(۳) ہر علت اپنے معلول سے افضل ہوا کرتی ہے لہذا
رسول اللہ ارض و سما سے اور علیؑ مرتضیٰ عرش و کرسی
سے افضل ہیں۔
(۴) عرش کو ذات علوی سے ایک خصوصیت حاصل ہے
اور عرش مسندگاہ ولایت ہے۔ حضرت رسول اللہ
جو عرش پر تشریف لے گئے تو بقدم ولایت تشریف
لے گئے تھے اور عرش پر جو کچھ آپ نے سنا وہ لافتیٰ
کی زبان سے سنا (توضیح کا محل نہیں)
(۵) صدر حدیث میں صرف خلقت محمدی و علوی کا
ذکر ہے۔ حسنین علیہم السلام کا نہیں ہے۔ مگر دوسری
انبیا کی خلقت ان کے انوار سے بتائی گئی ہے اور
خود ان بزرگوار کی خلقت کیونکر ہوئی اس کا کوئی
ذکر نہیں پس لامحالہ کہنا پڑے گا کہ خلقت محمدی
و علوی کے ذکر میں ہی ان کا ذکر مندرج ہے۔
(۶) لوح و قلم نور حسنی کے معلول ہیں اس سے علماء
حسنی پر کافی روشنی پڑتی ہے اور سطح جنت و حور العین
نور حسینی کی مرہون منت ہیں پس جنت کو حسین سے
خاص تعلق ہے اس سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حسین علیہ
السلام روز ازل سے مالک جنت ہیں اور عزاداران
حسین کے لئے جو موجب جنت کا وعدہ اگر ہوا ہے تو
بالکل صحیح ہے۔
(۷) جو انوار چہارگانہ عالم یکایک تاریک ہو گیا ہے

اور عرش کے سامنے ایک مخلوق عالم امر جس کی خلقت میں کوئی واسطہ اس حدیث سے مستنبط نہیں ہوتا) کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اس کے جلوے سے ظلمت دور ہوتی ہے اور ملائکہ آرام پاتے ہیں ان اول بہ آخر نسبتے دارد

عالم ظاہر میں بھی دیکھ لو کہ رسول اللہ صلعم کی تمام زحمات علی مرتضیٰ کے تمام جہاد بیکار تھے اگر سیدۃ النساء صلوات اللہ علیہا اپنے دلبند کو ظالم کی چھری کے تلے دیکھکر صبر کرتیں، فی الحقیقت شہادت حسینی میں حضرت سیدۃ النساء صلوات اللہ علیہا کا بہت بڑا حصہ ہے اور عملی طور انکی جانشین حضرت صدیقہ صغریٰ زینب کبریٰ صلوات اللہ علیہا نے اس کو ظاہر بھی فرما دیا ہے عالم ظاہر میں حضرت سیدہ صلوات اللہ علیہا کا یہ احسان عظیم ہے اور اسی سے ظلمت کفر دور ہوتی ہے جو عالم پر چھا گئی تھی،

(۸) جاحد نبوت کا نام کتاب الہٰی میں کافر ہے،

(۹) جاحد ولایت کو خدا کی زبان میں عنید کہتے ہیں،

(۱۰) عنید کا کفر کافر سے بڑھا ہوا نظر آتا ہے، اس لئے کہ ہر کافر کا عنید ہونا ضروری نہیں ہے مگر ہر عنید کا کافر ضرور ہے،

(۱۰) جنت و دوزخ کا داخلہ مشیت محمدی و علوی کا پر منحصر ہے، مشیت انہیں کے ہاتھ پر جاری ہوتی ہے، مشیت الٰہیہ کے کارکن ہاتھ یہی ہیں، ان کا وجود مقدس محل مشیت اللہ ہے بلکہ یہ خود مشیت اللہ میں

خیر یہ جو کچھ عرض ہوا ہے محض اپنے خیال کے مطابق ظاہر حدیث کا نتیجہ ہے، لیکن اسپر بھی اصرار نہیں کہ ہر شخص ان نتائج سے اتفاق ہی کر لے، ع

پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی

لیکن سوال ایک کھٹکتا ہے، اگر کوئی صاحب اس کا حل فرمائیں تو بڑی عنایت ہوگی اول تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ سوال کرتے ہیں کہ مجھے حق دکھا دیجئے کہ واصل بحق ہو جاؤں، آپ نے حجرہ کی طرف اشارہ کر دیا بہت اچھا کیا وہاں جو دیکھنا تھا دیکھ لیا، پھر خود ہی یا فضل ظاہر فرمایا جس سے سائل کا شک اٹھا، خیر اس کی بھی کوئی مصلحت ہوگی اور وہ ادنے تامل سے ظاہر ہو سکتی ہے مگر اس منظر کو دیکھکر ابن مسعود رض نے جو سوال کیا ہے ایکما افضل عند اللہ، عند اللہ آپ دونوں میں افضل کون ہے؟ اس کا جواب رسول اللہ نے کیا دیا ہے؟ ظاہر میں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خلقت ولیہ کا اجرا بیان کیا ہے اور آخر میں روز قیامت کی طرف اشارہ فرما دیا ہے اور بس،

حضرت والا! جواب اس کا سیدھا سادہ تھا فرما دیتے انا افضل، یا علی افضل، دو حرفی جواب تھا قصہ ختم، مگر یہ نہ وہ، بلکہ بظاہر ایک غیر متعلق قصہ، ہاں یہ بھی معلوم رہے کہ سائل عند اللہ افضلیت کو معلوم کرنا چاہتا ہے، عند الناس نہیں، مناسب ہوگا کہ میں اپنا خیال بھی عرض کرتا چلوں

یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت رسالتمآب صلے اللہ علیہ وآلہ نے ایک واقعہ بیان فرمایا ہے اور جواب میں بیان فرمایا ہے لہذا ضروری ہے کہ اس سے سائل کے جواب کو گہرا تعلق ہو اتنا تسلیم کرنے کے بعد عرض کیا جاتا ہے کہ اس جواب سے دو پہلو پیدا ہو سکتے ہیں میں ان دونوں کو بیان کر کے فیصلہ ناظرین بافہم پر چھوڑتا ہوں اور اسکے علاوہ اگر کوئی اور پہلو ہو تو اسے بھی سننے کا امیدوار ہوں،

پہلوئے اول، حضرت عبداللہ ابن مسعود کو جو ہر دو حضرات کی دعاؤں کو سنکر اضطراب دہول لاحق ہوا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی امر ایسا انہوں نے دیکھا جو ان کے عقیدے یا ایمان کے خلاف تھا، اور اس واقعہ کو دیکھکر وہ عقیدہ متزلزل ہو رہا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ عقیدہ یہی تھا کہ حضرت سرور کونین تمام مخلوقات سے افضل ہیں اور اس سانحہ کو دیکھکر جب اس عقیدہ میں تزلزل پیدا ہوا تو فوراً رسول اللہ نے فرمایا کہ اکفر بعد الایمان؟ ایمان کے بعد کافر ہوتے ہو یعنے اپنے عقیدے پر باقی رہو کہ میں افضل ہوں اور امیر ابن مسعود نے کہا کہ نہیں میں کافر تو نہیں ہو سکتا، لیکن یہ فرمایئے کہ آپ دونوں میں افضل کون ہے، حضرت رسول نے اس سوال کا جواب نہیں دیا اسلیئے کہ مجملاً پہلے وہ چکے تھے اور ایمان کے بعد کفر؟ فرما چکے تھے لیکن تفصیل بیان میں حضرت مرتضوی کے واسطے سے دعا مانگنے سے توجیہ فرمائی ہے، کہ میں باوجود افضل ہونیکے جو علیؑ کا واسطہ دیتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ مخلوقات میں اگر کوئی اس قابل ہے تو علیؑ ہی ہے، پھر علیؑ کے تعلقات اپنی ذات کے ساتھ بیان فرمائے اور بس اس پہلو کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت رسولؐ نے اپنی افضلیت کی تعلیم دیتے ہوئے حضرت مرتضوی کے فضائل کی طرف اشارہ کیا ہے، اس جواب کی بناء دو چیزوں پر ہے ایک سائل کا اعتقاد ابتدائی یعنے حضرت پیغمبر کی افضلیت مطلقہ کا اقرار اور دوسرے حضرت کا یہ ارشاد کہ کیا ایمان کے بعد کفر اختیار کرتے ہوگے؟ تنبیہ فرمائی ہے کہ اپنے پہلے اعتقاد پر قائم رہو اور اس سانحہ سے اپنے اعتقاد میں شک لاکر کافر نہ ہو

پہلوئے دوئم سائل سوال کرتا ہے کہ مجھے حق دکھا دیجئے، حضرت نے حجرے کی طرف اشارہ فرمایا جہاں حضرت امیرؑ مشغول نماز و دعا تھے سائل نے دیکھا، دعا بھی سنی، معمولی بات تھی لیکن جب واپس ہوئے تو رسولؐ کو مشغول نماز و دعا پایا، اور اب انہیں اضطراب لاحق ہوا، اور ہونا ہی چاہیئے تھا اسلیئے کہ حق کو دیکھنے اور عمل کرنے کے لیئے تبلیغ کی ضرورت ہے یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ رسولؐ کی اسوقت نماز و دعا نے، بحقیقت تکمیل اداءِ حق کے لیئے ہے یعنے چاہتے ہیں کہ حق مکمل اسے دکھا دیا

جائے اور حقیقت عیان ہوجائے پس فی الحقیقۃ یہ فعل نبوی تتمہ ہے فعل علوی کا اور اگر یہ نہ دکھایا جاتا تو گویا سائل نے کچھ دیکھا ہی نہ تھا اب جبکہ حق کمل اسے حق دکھا دیا گیا اور عین الیقین کے درجے میں اسے داخل کردیا گیا اپنے فعل سے ہدایت ظاہر فرما دی اور ظاہر ہے کہ ہدایت فعلی ہدایت قولی سے قوی ہوتی ہے تو اس رویت حق و حقیقت کے بعد جو اضطراب اسے لاحق ہوا تو اس اضطراب کو دیکھکر رسولؐ کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ ایمان کے بعد کفر؟ تمہارا سوال پورا کردیا گیا حق تمہیں دکھا دیا گیا، پھر اضطراب و پریشانی کے کیا معنی؟

یہ بھی واضح رہے کہ اس مقام میں جو کفر کا ذکر آیا ہے وہ کفر مشہور نہیں ہے بلکہ وہ کفر ہے جس سے مدارج ایمانیہ کے سالک کو قدم قدم پر سامنا کرنا پڑتا ہے غرض یہ تنبیہ سنکر ابن مسعود سنبھل گئے اور پھر مزید تشریح کی طلب فرمائی کہ آپ دونوں میں عنداللہ افضل کون ہے کیونکہ عندالناس جو مشہود ہے اس کی حقیقت تو مجھپر کھل گئی اب اللہ کے پاس کیا معاملہ ہے وہ بیان فرمایئے آپ نے واقعہ خلقت بیان فرمادیا جس سے یہ تبادر نظر ہے کہ اس کے پاس ہماری فضیلت و مفضولیت کا قصہ ہی نہیں ہم دونو مقام عظمت سے خلق ہوئے اور آخری انجام بھی مخلوق کا ہمارے ہی ہاتھ پر ہوگا، پس حق کو دیکھ لینے کے بعد تم اس سوال کے مجاز ہی نہیں ہو جو تم نے دیکھا ہے اسے تحمل کے ساتھ اپنے سینے میں مدفون رکھو،

اس پہلو کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن مسعود کو فضیلت اور مفضولیت کے سوال سے روکا گیا ہے اور اس سے ہم یہ استنباط کرسکتے ہیں کہ اس میدان میں قدم رکھتے ہوئے حذر کرنا چاہیئے، نزلونا عن الربوبیۃ وقولوا فینا ما استطعتم ولن تبلغوا ہمیں مخلوق و مربوب سمجھتے ہوئے جو استطاعت رکھتے ہو کہو تم پہنچ ہی نہیں سکتے کہو گے کیا ؎

سالک شتاب این رہ دین است نہ صحرا
ہشیار کہ رہبر دم تیغ است قدم را

امتحاناتِ شیعہ

ہم ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں کہ ظاہری طور سے کوئی امتحان ہمارے سامنے موجود نہیں ہے، بالکل آرام اور آزادی کا زمانہ ہے، مذہبی معاملات میں آزاد ہیں اور ہم کیا آزاد ہیں، تمام اہل مذاہب آزاد ہیں مگر اس آزادی سے ہم نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا سوا اسکے کہ طبیعتوں میں سہولت پسندی پیدا ہوگئی اور یہاں تک نوبت پہنچی، کہ جس امانت کو سابقین نے ہزار ہا صدمے اٹھاکر ہم تک پہونچایا تھا وہ ہماری نظر میں اتنی بے وقعت ہوگئی کہ اس سے بڑھکر

بے وقعتی مقصود نہیں ہو سکتی،

تاریخ شاہد ہے کہ تشیع کی پرورش ابتداء سے مصائب و نوائب کے سائے میں ہوئی ہے، حکومت کے محلوں اور جاہ و جلال سلطانی کی مسندوں کا یہ مذہب ممنونِ احسان نہیں ہے، اسکی ساخت عناصرِ زرین سے نہیں ہوئی، بلکہ بلا، ابتلا، مصیبت، مظلومیت، مقتولیت غرض ہر قسم کے مصائب پر اسکی بنیاد رکھی گئی ہے،

ان تمام ابتلاءات و مصائب میں سب سے بڑھکر جو مصیبت ہے وہ تقیہ ہے، جس کی بناء پر آج بھی اس فرقے کو طرح طرح سے مطعون کیا جاتا ہے، بالکل صحیح ہے ؎

کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

اصل یہ ہے کہ تقیہ ایک بلائے سخت ہے جس پر رضا مند ہونا اور بخوشی برداشت کرجانا ہر ظرف کا کام نہیں، ان یہ انہیں لوگوں کا کام ہے جن کی نظر حقائقِ امور پر ہو اور اس نظر نے انہیں دنیا و مافیہا سے مستغنی کر دیا ہو، جو امر بھی پیش آئے اس کے برداشت کرنے میں انہیں ذرا بھی اضطراب نہیں ہوتا ان کی نظر ہر شے کے باطن پر ہوتی ہے چاہے اس کا ظاہر کتنا ہی قبیح نظر آئے،

واضح رہے کہ اگر کوئی امر ایسا پیش آئے کہ جس کا ظاہر نہایت قبیح ہو مگر باطن میں خاص اسرار موجود ہوں اس کا برداشت کر لینا یا اس حکیم کا کام ہے جس کے لئے اس کا باطن مقام ظہور و شہود میں آچکا ہو، اور یا اس مومن کا کام ہے جس نے اپنے آپ کو اپنے رہنما کے اس حیثیت سے سپرد کر دیا ہو کہ چون و چرا کے تمام خیالات اس کے دماغ سے نکل چکے ہوں، نہ اس کا کوئی ارادہ نہ اختیار نہ خواہش نہ تمنا ہے

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مثال کے لئے یہ واقعہ سنئے، نعمان بن بشیر راوی ہے کہ میں جابر ابن یزید جعفی علیہ الرحمہ کے ساتھ ہم ردیف تھا، وہ مدینہ میں آئے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت سے مشرف ہوئے پھر حضرت سے رخصت لی، خوشی خوشی وداع ہوئے اور کوفہ کو واپس چلے جمعہ کا دن تھا جب پہلی منزل میں پہنچے ہم نے ظہر کی نماز پڑھی جب چلنے لگے تو ایک شخص طویل القامت آتا ہوا نظر آیا اس نے جابر کو ایک خط دیا جس پر امام کی مہر تھی اور ابھی تازہ تھی جابر نے پوچھا کہ تم میرے آقا کے پاس سے کب چلے تھے اس نے کہا ابھی ابھی، پوچھا نماز سے پہلے یا نماز سے بعد، اس نے کہا نماز سے بعد، اب جابر نے مہر توڑی، خط کو کھولا، پڑھا اور پڑھتے ہی چہرے پر انقباض کے آثار نمایاں ہو گئے، خط لپیٹ لیا اس وقت سے میں نے جابر کو ہنستے یا مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تا آنکہ وارد کوفہ ہوئے، میں دوسرے دن صبح کو جابر

سے ملنے گیا، وہ باہر نکلے مگر عجب حال سے، گلے میں ایک
ہار سا پڑا ہوا، سر کنڈے پر سوار اور لب پر یہ کلمات
اجد منصور بن جمہور امیراً غیر مامور، ہماری نگاہیں
چار ہوگئیں جابر کچھ نہ بولے، میری بھی زبان سے
کچھ نہ نکلا، مگر آنسو جاری ہوگئے، لڑکے اور آنے جانے
والے ہمارے گرد جمع ہوگئے، یہاں تک کہ جابر رحبہ
(محلہ کوفہ) میں آئے اور لڑکوں کے ساتھ گردش کرنے
لگے لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ جابر بن یزید مجنون ہو
گئے ہیں، کچھ دن اسپر گذرے یہاں تک کہ ہشام
بن عبدالملک کا فرمان والی کوفہ کے نام پہنچا کہ جابر کو
قتل کرکے اس کا سر ہمارے پاس بھیجدو، والی کوفہ نے
اپنے درباریوں سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے وہ بولے
کہ یہ بیچارہ صاحب علم و فضل تھا، محدث تھا، حاجی تھا
مگر اب تو دیوانہ ہے اور اس وقت بھی رحبہ میں لڑکوں کے
ساتھ کھیل رہا ہوگا، سر کنڈے پر سوار ہوگا، والی کوفہ
دیکھنے کو پہونچا اسی حالت میں جابر کو پایا، یہ دیکھکر اس
نے کہا کہ الحمد للہ میں اس کے قتل سے بچگیا اور کچھ دن
نہ گذرے تھے کہ منصور بن جمہور داخل کوفہ ہوا اور
وہی افعال اس سے ظاہر ہوئے جن کی طرف جابر رض
اشارہ کرتے تھے، المختصر جابر رض اسیطرح مجنون بنے رہے
یہانتک کہ ہشام کی خبر مرگ پہنچی اسکی صبح کو دیکھا گیا
کہ جابر مسجد میں بیٹھے ہیں اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام
کی احادیث بیان کر رہے ہیں،

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جابر نے بحکم امامؑ جنون اختیار کیا تھا
کہنے کو معمولی بات ہے لیکن ایک عاقل اپنے آپ کو ایسا
مجنون بنالے کہ اسکی ہر ادا سے جنون ظاہر ہو مشکل ہے
اور سخت مشکل، آج ہم اپنے دلوں پر ہاتھ رکھکر دیکھیں
کہ آیا ہم میں یہ قابلیت ہے آیا ہم اس امتحان میں کامیاب
ہوسکتے ہیں؟ عوام کو جانے دیجئے وہ لوگ جو ادعائے معرفت
امام کرتے ہیں اور انتہائی تعلّی کے ساتھ فرماتے ہیں
کہ خدایا میں ان چہاردہ معصومین کے مدارج و مراتب کا
شناسا ہوں ایسی نظیر پیش کرنے کے اہل ہیں؟
اور ملاحظہ فرمائیے، ایک مومن کامل کو معصوم کی زبان
سے جنتی کا خطاب ملتا ہے اس کے کفر کی شہرت ہوتی
ہے یہانتک کہ آج بھی بعض بے بصیرت بھی اعتراض
کرتے ہیں اور شیعوں کو طعنہ دیتے ہیں،
محدثین مذہب شیعہ میں زرارہ بن اعین شیبانی کوفی کا
نام محتاج تعریف نہیں ہے، اور امام علیہ السلام نے
عوام کے سامنے ان کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بھی
کتب میں موجود ہے، حتی اینکہ یہ بزرگوار ایک شخص سے
سوال کرتے ہیں، کہ تم میری نسبت حضرت ابوجعفر امام
محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کرو، کہ میں جنتی ہوں
یا دوزخی وہ حیران ہوتا ہے کہ یہ بات کیونکر معلوم
ہوسکتی ہے مگر زرارہ اصرار کرتے ہیں بالآخر وہ شخص
پوچھتا ہے اور امامؑ فرماتے ہیں کہ وہ اسی دعوے کے
سبب سے کہ میں اہل جنت و نار کو جانتا ہوں ناری ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ زرارہ علیہ الرحمہ جان بوجھکر اپنے کفر کی
شہرت چاہتے ہیں اب یہ ملاحظہ فرمایئے کہ امام کی زبان
سے جو الفاظ ان کے لئے استعمال ہوئے ہیں ان کی حقیقت
اور مصلحت کیا ہے؟

عن عبد اللہ بن زرارۃ قال قال لی ابو عبد اللہ
علیہ السلام اقرء منّی علیٰ والدک السلام و
قل لہ انّی انّما اعیبک دفاعاً منّی فانّ الناس
والعدو یسارعون الی کل من قربناہ و
حمدنا مکانہ لادخال الاذی فیمن نحبّہ
ونقربہ ویرمون لمحبّتنا لہ وقربہ ودنوّہ
منّا ویرون ادخال الاذی علیہ وقتلہ و
یحمدون کل من عبناہ نحن فانّما اعیبک
لانّک رجل اشتہرت بالمیلک الینا وانت
فی ذالک مذموم عند الناس غیر محمود
الاثر فاحببت ان اعیبک لیحمدوا امرک
فی الدین ویکون ذالک منّا رفع شرھم
عنک لقول اللہ عزّ وجل اما السفینۃ فکانت
لمساکین یعملون فی البحر فاردت ان اعیبھا
وکان وراءھم ملک یاخذ کل سفینۃ
غصباً فافھم المثل یرحمک اللہ فانّک
واللہ احبّ الناس الیّ واحبّ اصحاب ابی
حیّاً ومیّتاً وانّک افضل سفن ذالک البحر
القمقام الذاخر من وراءک ملکاً
غصوباً یرقب عبور کل سفینۃ صالحۃ ترد
من بحر الھدیٰ لیاخذھا غصباً ثمّ
یغصبھا واھلھا الخ محمد بن زرارہ کہتے ہیں کہ
حضرت صادق علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا کہ اپنے
والد کو میرا سلام پہونچاؤ اور کہو کہ ہم جو اسے عیب دار
کرتے ہیں یعنے فی الحقیقت اپنی طرف سے ہم اسکا دفاع
کرتے ہیں اسلئے کہ لوگ اور دشمن ہر اس شخص کو نقصان
اور اذیت پہونچانے کے لئے دوڑتے ہیں جسے ہم اپنا
مقرب بنائیں جس کی مدح کریں اور اس تقرب اور
نزدیکی کے سبب اسے تکلیف پہونچانے اور قتل کرنے
در پے ہو جاتے ہیں اور جس کا ہم عیب بیان کریں
اس کی مدح و ثنا کرتے ہیں پس ہم تجھ میں عیب نکالتے
ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ تو ہمیں پیارا اور محبوب ہے اور
یہ امر لوگوں میں مشہور ہو چکا ہے اور اسی سبب سے تو
لوگوں کے نزدیک مذموم ہے اور تیری بیان کردہ حدیث
ان کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے پس ہم چاہتے ہیں
کہ تیرا عیب بیان کریں تاکہ لوگوں کے نزدیک تیرا دین
پسندیدہ ہو جائے ہمارا یہ فعل اسی لئے ہے کہ تجھ سے
دشمن دور رہیں اور ہمارا یہ فعل اس ارشاد الہٰی پر مبنی
ہے کہ کشتی ان مسکینوں کی تھی جو دریا میں کاروبار
کیا کرتے تھے میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کردوں
کیونکہ ان کے عقب ایک بادشاہ تھا جو ہر صحیح
سالم کشتی کو غصب کر لیتا تھا اب اس مثال کو سمجھ

خدا تجھپر رحم کرے کیونکہ تو ہماری نظر میں سب سے زیادہ محبوب ہے اور ہمارے پدر بزرگوار کے محبوب ترین اصحاب میں سے ہے حیات میں بھی اور ممات میں بھی اور تو اس بحر و خار و متواج دہلایت کی بہترین کشتی ہے تیرے عقب میں بادشاہ غاصب موجود ہے جو ہر صحیح و سالم کشتی کو جو بحر ہدایت میں سے عبور کر رہی ہے دیکھتا رہتا ہے تاکہ اسے غصب کر لے چنانچہ وہ کشتی اور اہل کشتی کو غصباً کر لیتا ہے"

یہ ایک ظاہر امر ہے کہ کوئی شخص اپنے دوست کو برا نہیں کہتا جب تک کہ کوئی خاص مصلحت مد نظر نہ ہو اور اسیطرح کوئی وفادار غلام اپنے آقا کی طرف سے برا سننا نہیں چاہتا، جب تک کہ کسی خاص مصلحت کا علم نہ ہو جائے مگر باوجود اس کے بھی طرفین کے لئے اس فریضہ کا ادا کرنا جس قدر ناگوار ہو سکتا ہے وہ محتاج تشریح نہیں،

اس حدیث میں امام علیہ السلام نے قصہ حضرت حضرت خضرؑ سے جو استدلال فرمایا ہے وہ اہل قلب کو وجد میں لانے کے لئے بہت کافی ہے، اسی سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقتاً قرآن ان کے لئے ہے اور یہ قرآن کے لئے بلکہ یہی قرآن ناطق ہیں،

الغرض اس بیان سے خلاصہ مقال یہ ہے کہ ان مصائب و مکارہ کے صدمات اٹھاتے ہوئے یہ دین ہم تک پہونچا، جنہوں نے اس دین کی راہ میں قربانیاں کی تھیں وہ اس کی قدر بھی جانتے تھے لیکن ہمیں یہ دولت گھر بیٹھے مل گئی ہے اس کے لئے کوئی تکلیف اٹھانی نہیں پڑی لہذا ہمارے دل میں کچھ اس کا درد بھی نہیں،

یہ دولت جن گھروں میں پائی جاتی ہے اب ان میں دو فریق ہیں، ایک فریق کو تو اس کی پرواہی نہیں نہ اس کی بقا کی خوشی اور نہ جانے کا غم، بلکہ ان کے نزدیک اگر چلی جائے تو اچھا اس کی حفاظت میں بہت کچھ ہرج ہوتا ہے دوسرے فریق کا یہ حال ہے کہ ایک دوسرے کو اس دولت سے محروم کرنے میں ساعی ہے،

میں جب شیعوں میں باہمی لعنت بازی دیکھتا ہوں تو ایک لحاظ سے بہت خوش ہوتا ہوں کیونکہ یہ بھی علائم ظہور میں سے ایک علامت ہے حتی یلعن بعضکم بعضاً و یتفل بعضکم علی وجہ بعض ایک دوسرے پر لعنت کرے اور ایک دوسرے کے چہرے پر تھوکے،

انصاف سے فرمایئے کہ وہ مبلغین جن کی یہ شان ہو وہ کونسے مذہب کی تبلیغ کرتے ہوں گے؛

مذہب اثنا عشریہ کی ترویج میں عرفان

کاروانِ گل ؎

یہاں ہے وہ غیرت خورشید و قمر آج
دن آج ہے رات آج ہے شب آج سحر آج
موسیٰ نے نہ دیکھا تھا سر طور وہ جلوہ
دیکھا ہے جو ہم نے پسِ روزن دَر آج

قال علیہ السلام وسلم واسفینتکم فان البحر عمیق یعنی حضور فرماتے ہیں اپنی کشتیوں کو مضبوط بناؤ کیونکہ دریا بہت گہرا ہے اور دریا سے کیا مراد ہے؟ القرآن بحر عمیق واکثر فیہ غرقی غرض یہ کہ قرآن پاک ایسا گہرا سمندر ہے جس کے اندر اکثر بڑے ڈوب گئے ہیں اور خدا نے قرآن میں خود تنبیہ کردی ہے یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً قرآن کی دشواریوں کی نسبت خدا نے خود فرما دیا، لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرایتہ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ حضور صلعم نے فرمایا القرآن ھو الدّواء قرآن دوا ہے مگر یہ دور آزادی کا ہے جس نے اردو زبان میں کچھ کتابیں پڑھ لیں وہ آزاد اور استاد کامل بن گیا جو چاہتا ہے وہ قرآن کے معنے بیان کرتا ہے جدھر چاہتا ہے دین کے بیڑے کو لے جاتا ہے اسے صحابہ کے مسلک اور آئمہ اور مفسرین کے مذہب سے سروکار نہیں رہا وہ کسی کی پروا نہیں رکھتا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رہا ہے کاش اسے متقدمین علماء اور شائقین، اولیا اللہ کے فضل و کمال پر عبور ہوتا، اور وہ سمجھ سکتا کہ قرآن میں کیا بھید بھرے پڑے ہیں اور قرآن سے کیونکر ارشاد اور ہدایت حاصل ہو سکتا ہے حضرت عبد اللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں ایک رات کو شاہ مردان حیدر کرار کے حجرے میں حاضر تھا جو آپ نے بسم اللہ کے کچھ اسرار بیان فرمانے شروع کئے اور ارشاد فرمایا العلم نقطۃ کثرۃ الجاھلون واسرار الکلام فی القرآن واسرار القرآن فی الفاتحۃ و اسرار الفاتحۃ فی بسم اللہ الرحمن الرحیم واسرار بسم اللہ الرحمن الرحیم فی باء بسم اللہ واسرار الباء فی نقطۃ التی تحت الباء وانا نقطۃ تحت الباء یعنی علم تو ایک نقطہ ہے جاہلوں نے اسے طول دیدیا ہے اللہ کے کلام کے بھید سب قرآن میں ہیں اور سارے قرآن کے بھید سورہ فاتحہ میں ہیں اور سورۂ فاتحہ کے سب بھید بسم اللہ الرحمن الرحیم میں اور بسم اللہ الرحمن الرحیم کے سارے بھید

؎ یہ مقالہ معاصر جلیل اصلاح کھجوہ ضلع سارن نے نظام المشائخ سے نقل فرمایا ہے اور اصلاح سے عرفان میں منقول ہوا ہے ۱۲

بسم اللہ کی ب کے نقطہ میں اور میں بسم اللہ کی بے
نیچے کا نقطہ ہوں، عبد اللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ
عشا کے وقت سے جناب امیرؑ نے بسم اللہ کے اسرار
بیان کرنے شروع کئے تھے جو آدھی رات آگئی،
حجرہ کا دروازہ کھلا تھا میں نے دیکھا کہ تارے
جو مشرق کی طرف سے چلے تھے وہ مغرب کی طرف
چلے گئے اور حضرت کی گفتگو کا سلسلہ بدستور جوش
مار رہا تھا ابر نیسان گوہر آبدار برسا رہا تھا میں نے
اچھی طرح جان لیا تھا کہ میری استعداد اور قابلیت
ایک چھاگل سے زیادہ نہیں ہے جس میں چند قطرے
پانی کے ہوں اور آپ ایک سمندر ہیں معلومات اور
کمالات کے جس نے روئے زمین کو گھیر لیا ہے حضرت
کی تقریر بسم اللہ کے معارف میں جاری تھی جو میں
نے دیکھا لیلائے شب نے اپنی کالی زلفوں کو
سمیٹ لیا اور صبح دلکشا نور کا آئینہ لئے حضرت کے
در دولت پر حاضر ہوئی اور حضرت نے اور میں نے
نماز کے لئے مسجد نبوی کی راہ لی، جناب امیرؑ کے
اس ارشاد سے قیاس ہوتا ہے کہ بعد رسولِ
پاک کے آپ کی ہی ذات والا صفات ہے جو سراپا
قرآن سراپا عرفان تھی مگر اس کے آگے سید محمد جعفر
مکی بحر المعانی کے ص ۸۰ پر تحریر فرماتے ہیں، "گو
کہ در مناقب علی کرم اللہ وجہہ کوشش بلیغ میکند
در ہندوستان ہر کہ دو بار نام علیؑ مے گیرد او را
رافضی مے گویند واللہ اگر مناقب او کہ مشاہدہ کردہ
ام بر زبان رانم جہال آفتاب را شاعے نمانند"
اور سید صاحب کے اس بارے میں زور دینے کا
منشا یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ مطلع ولایت اور سر
چشمہ ہدایت ہیں، جب حضور والا کو شب معراج میں
قربت الٰہی حاصل ہوئی تو خدا نے فرمایا اے محمدؐ
اپنے اصحاب سے کہدو کہ اپنے اپنے دروازے جو
مسجد میں ہیں بند کرلیں، سوائے دروازہ علیؑ کے
چنانچہ صبح کو حضور نے فرمایا "انی امرت بسد
ھذہ الابواب غیر باب علیٍ" اس حدیث کے
کے ظاہری معنے تو ظاہر ہیں مگر اس کی اندرونی
مراد یہ ہے کہ سرچشمہ فقر صرف علیؑ ہی رہیں گے[1] اگرچہ
نقشبندیہ طریقہ حضرت ابوبکر صدیق سے منسوب ہے
مگر غور کر کے دیکھئے اس میں فیضان مرتضوی
بخوبی جاری و ساری ہے اور جناب امیر علیہ السلام
کی ذات گرامی کو اسی باعث سے رسول آخر الزمان
کے علمائے دین اور اولیائے کرام نے معجزہ
محمدی کہا ہے اور فقیر فراق بھی اسی وجہ سے اس
کے متعلق خامہ فرسائی کر رہا ہے کہ جدی و مرشدی
مولا علیؑ کے کمالات اور مقامات نظام المشائخ

[1] اس تاویل کی تکمیل اس طرح فرمائیے کہ آفتاب
محمدیت کی جلوہ گاہ دو مکان نہیں ہو سکتے جن کے
دروازے بیت اللہ کی طرف سے بند ہو چکے ہیں"

کے پڑھنے والے اپنے دیدۂ بصیرت کو روشن کریں
اور اس بارے میں قرآن پاک ایک لطیف اشارہ
کرتا ہے اما الجدار فکان لغلامین یتیمین فی
المدینة وکان تحته کنز لهما یعنے دیوار
شریعت دو یتیموں کی ملکیت ہے ایک در یتیم محمدؐ اور
دوسرے یتیم علیؑ مرتضٰی اور ان دونوں کے لئے
ایک خزانہ پوشیدہ ہے اس دیوار شریعت کے نیچے
نبوت اور ولایت کا، چنانچہ نبوت کا خزانہ رسولؐ
اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ ختم کر گئے اور ولایت کا خزانہ
قیامت تک کھلا ہوا ہے اور حضرت امیر المومنین
علیؑ اور آپ کے جانشین اسے لٹا رہے ہیں اور لٹاتے
رہینگے جناب ولایت آپ کے ہاتھ سے مقتول ہو جانیکو
مقتول کے وارث اپنی عزت اپنا فخر سمجھتے تھے
جب آپ کی شمشیر خارا شگاف سے عمرو ابن عبدود
پارہ پارہ ہو تو میدان جنگ میں اس کا بھائی حاضر
تھا جب اس نے اپنے بھائی کی منادی سنی تو دوڑا
آیا اور لوگوں سے پوچھنے لگا میرے بھائی کو کس نے
ہلاک کیا ہے کہا گیا علیؑ ابن ابیطالب نے اس نے کہا
بڑے فخر کی بات ہے کہ میرا بھائی کفو کریم کے ہاتھ
مارا گیا علیؑ ابن ابیطالب وہ شخص ہے جسے دوست
دشمن بیضۃ البلد کہتے ہیں ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

جب خیبر کی فتح کرنے کے لئے علی جھنڈا لیکر چلے تو حضور
رسالت پناہ نے فرمایا فاتح خیبر کا نام یہود کی کتابوں
میں لکھا ہے وہ جب لڑائی ہوگی تو تم سے نام پوچھینگے تو
تم کہدینا کہ میرا نام ایلیا ہے اس نام کو سنکر ان کی ہمت
ٹوٹ جائیگی اور وہ ہتھیار ڈالدینگے تم غدیر پر حضور صلعم نے
فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ تو سب نے تسلیم سر
جھکا دیا اور کسی نے اُف نہیں کی حاضرین اور سب نے
آپکے ارشاد کو سن رکھا تھا جو قبیلہ نصار کا ایک تنومند نوجوان
حارث بن نعمان اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اسکا منہ غصہ سے
تمتما رہا تھا اسکی ناک اور آنکھ سے شعلے نکل رہے تھے وہ
زمین پر پاؤں مارتا ہوا آپکے پاس پہنچا، اور اس نے کہا
یا محمدؐ سن لے پہلے تو نے ہم سے کہا خدا کی توحید قبول کرو
ہم نے چپ چپاتے خدا کو ایک مان لیا پھر تو نے پنج
نمازیں فرض کیں ہم نے ٹھنڈے پیٹوں انہیں بھی مان لیا
پھر تو نے کہا روزے رکھو ہم بے دم روزے بھی رکھنے لگے
پھر تو نے کہا زکوٰۃ دو ہم نے کان نہیں ہلایا اور زکوٰۃ دینے
لگے پھر تو نے کہا حج کرو ہم نے اسے بھی منظور کر لیا
مگر افسوس کہ تو ہم سے کسیطرح پر راضی نہوا اب یہ ڈھکوسلا
من کنت کا تو نے نکالا ہے یا خدا کی طرف سے حکم ہوا ہے
حضور صلعم نے جواب دیا کہ میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں
کہتا یہ حکم الٰہی ہے، اس نے کہا اے محمدؐ اگر یہ حکم الٰہی ہے
تو اپنے حکم کی تصدیق کیلئے خدا آسمان سے ایک پتھر گرا دیا
بھیجے جو میرے سر کو پاش پاش کر دے یہ کہکر حارث اپنے

ناقہ کیطرف بڑھا اور ابھی اسنے ناقہ کی مہار کو ہاتھ نہ لگایا تھا
جو آسمان سے ایک چھوٹی سی پتھر کی کنکری آئی اور حارث
کی چندیا میں لگی اور اسکے تن بدن کو چیرتی ہوئی اسکی
کھڈی میں سے نکل گئی اسی وقت حاضرین دیکھکر توبہ توبہ
کرنے لگے اس روایت کو جعفر صادقؑ کے حوالے سے سفیان
بن عینیہ نے بیان کیا ہے جب آپ سے سائل نے اس آیت کی
تفسیر پوچھی گئی تھی اہرام مصر کے پرانے مینار تمام عالم میں مشہور ہیں
جالینوس جب مصر میں آیا تو انہیں دیکھکر اسکی آنکھیں کھلی کی
کھلی رہ گئیں بہت حیران بہت پریشان ہوا جتنے دن مصر میں
رہا اسنے بہت کوشش کی کہ یہ معلوم کرے اہرام کس نے بنائے
اور کس سن میں بنائے مگر پتہ نہ چلا کچھ لوگ مدینہ کے مصر گئے اور
اہرام کو انہوں نے بھی دیکھا بھالا اور مدینہ پلٹ کر آئے تو
اہرام مصری کی نسبت آپ سے سوال کیا کہ حضور کی رائے میں اہرام کی
عمر کیا ہوگی جناب امیرؑ نے فرمایا تم ابھی اہرام دیکھکر مصر سے
چلے آتے ہو بتاؤ ان میں سے کیسیر کوئی تصویر کندہ ہے
انہیں ان لوگوں نے کہا تصویر کندہ ہے ایک چیل اپنے پنجے میں
ایک کیکڑے کو پکڑے ہوئے ہے آپ نے فرمایا بالکل ٹھیک کہتے
ہو یہی البرہان والنسر السرطان یعنے اسکا بنانے والا
تصویر بنا کر اشارہ کرتا ہے کہ جب نسر طائر جو گدہ کی
صورت کا ایک تارہ ہے وہ برج سرطان میں تھا اسوقت یہ
مثلث نما مینار بنائے گئے ہیں اور نسر طائر کی رفتار یہ ہے کہ وہ
۲ ہزار سال میں برج طے کرتا ہے اور فی الحال نسر طائر برج
جدی میں ہے تو اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ اہرام
مصری کو بنے ۱۲ ہزار سال ہوئے یہ جواب سنکر سائل اور دیگر
حاضرین بزم سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگے اس توجیہ
سے قیاس کیجئے کہ جناب امیرؑ کو علم ہیئت اور نجوم میں
کس قدر دخل تھا اب میں جناب امیرؑ کی ولایت اور
جناب بشیر و نذیر کی رسالت کا ایک انوکھا لطیفہ عرض کرتا ہوں

جب عارض حسن بے نقاب ہو جاتا ہے ۱؎
بنتا ہے کہیں رحمی کہیں کتاب ہو جاتا ہے
احمدؐ کہیں شبرؑ کہیں شبیرؑ کہیں
پھر آپ ہی آپ بوترابؑ ہو جاتا ہے

پانی پت کے رہنے والے شیخ اللہ دیا ابن شیخ عبدالرحیم
صاحب حضرت شاہ کبیر الاولیا کی اولاد میں سے ایک
بزرگ گذرے ہیں آپ چشتی صابری ہیں آپ نے ایک کتاب
خواجگان چشت کے حالات میں لکھی ہے جس کا نام
سیر الاقطاب ہے شیخ اللہ دیا اور آپ کے بھائی شاہجہان
بادشاہ کی سرکار عالیہ میں منصبدار تھے اور اپنے آقا کے
ہمراہ کابل جا رہے تھے جب لشکر چار باغ کی منزل پر
پہنچا تو شیخ صاحب اور انکے برادر کا خیمہ بھی ایک ندی
کے کنارے لگایا گیا عصر کے وقت شیخ صاحب کے برادر
ندی کے کنارے چوکی کے فرش پر گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے
تھے اور سیر الاقطاب دیکھ رہے تھے کیونکہ عنقریب مصنف
نے اسے مسودہ سے صاف کیا تھا عین مطالعہ کے وقت
بھائی صاحب اس کتاب کو گاؤ تکیہ پر کسی ضرورت سے اپنے
خیمہ میں گئے ادھر آندھی بھی آن پہنچی ہوا کے ایک جھونکے نے

۱؎ موزونیت قابل داد ہے ۱۲

بیر الاقطاب کو ندی میں ڈالدیا اس فراتفری میں فراش لوگ چاندنی گاؤ تکیہ غالیچہ تو چوکی پر سے اُٹھا لائے اور کتاب بیکو یاد نرہا یہانتک کہ صبح ہو گئی اور شیخ صاحب کے بھائی وضو کرنے چوکی پر تشریف لائے ندی کا پانی آئینہ کی مانند شفاف تھا انہوں نے دیکھا کہ بیر الاقطاب کی جلد تو پانی پر تیر رہی ہے اور کتاب ندی کی تہ میں زمین سے لگی پانی میں ڈوبی پڑی ہے اس حال کو دیکھکر انکے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی بھائی صاحب نے اپنے نوکروں کو پکارا اور کف افسوس ملکر کہا دیکھو غضب ہو گیا ندی میں کتاب ڈوبی پڑی ہے، نوکروں نے اپنے کپڑے بھی نہ اُتارے بے تحاشا ندی میں اُتر گئے کتاب نکالنے پر معلوم ہوا کہ باوصف ساری رات ندی میں پڑی رہنے کے سوائے جلد الگ ہونے اور سادہ کاغذوں کے بھیگ جانے کے اصل کتاب تر ہوئی ہے نہ اسکا کوئی حرف مٹا نہ بگڑا نہ خراب ہوا اگے سارے اُردوئے معلے میں دہوم ہو گئی کہ خواجگان چشت کے نام کو کوئی کیا مٹا سکیگا انکے نام کی کتاب کو دریا کا پانی مٹا ہی نہ سکا، اسکے علاوہ اس کتاب کو رسول مقبول اور خواجہ خواجگان معین الدین چشتی نے ملاحظہ فرمایا اور مصنف کو داد دی ہے اس کتاب مستطاب میں شیخ الہ دیا صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ بعد وفات حضور صلعم کے ابوبکر کے دور خلافت میں ان کے پاس ایک اعرابی آیا اور اسنے کہا رسول پاک لال

اون کے سو اونٹ قرض قیمت پر مجھ سے لائے تھے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب تمہارا جی چاہے مدینہ آجانا، اونٹوں کا مول یا اپنے اونٹ سو کے سو لے لینا مگر مجھے کئی سال تک فرصت نہوئی اب ذرا دھندوں سے چھٹکارا ہوا ہے تو آیا ہوں مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ حضرت نے انتقال کیا مگر آپ انکے جانشین ہیں آپ میرے اونٹوں کی قیمت دیجئے یا اونٹ پھیر دیجئے، ابوبکر، مجھے ہرگز معلوم نہیں کہ تم سے آنحضرت نادار سو اونٹ قرض دام پر لائے تھے نہ میں نے حضرت کی زبانی سنا نہ سو اونٹ لال اون کے میں نے دیکھے کوئی کاغذ یا سند حضرت کی لکھی ہوئی ہو تو تم مجھے دکھاؤ یا کوئی گواہی لاؤ،

اعرابی میرے پاس نہ کاغذ ہے نہ گواہ مگر مسلمان ہوں اتنا ظالم نہیں بن سکتا کہ اپنے پیغمبر پر تہمت تراشوں یہ کہکر اعرابی زار و قطار رونے لگا،

ابوبکر، تم رو دھو یا دہو شریعت ایسے بے ثبوت دعوے کو تسلیم نہیں کرتی ہے،

اعرابی ابوبکر کے پاس سے اُٹھا اور مدینہ کی گلیوں میں چکر لگانے اور لوگوں کو اپنا درد دل سنانے لگا کسی نے اسے صلاح دی کہ عمر بھی بڑا مرتبہ رکھتے ہیں تو انکے پاس جا کر اپنی مصیبت سنا یہ بات اس اعرابی کے دل کو لگی وہ عمر کی خدمت میں پہنچا اور اپنی بپتا انہیں سنائی آپ نے فرمایا ابوبکر اسوقت نائب رسول ہیں

اللہ ہیں اور ہم سب انکے ماتحت ہیں جو کچھ انہوں نے فرمایا بجا فرمایا ہم لوگ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے، اعرابی عمر کی گفتگو سنکر بہت مایوس ہوا اور آنسو بہاتا چیختا چلاتا چلا جاتا تھا جو ایک شخص نے کہا یا شیخ تم مولا علیؑ کے دروازے پر جاکر دوہائی دو وہ وصی رسول اللہ کہلاتے ہیں وہ ایسے الجھے مسئلے چٹکیوں میں حل کر دیتے ہیں جب مشکل بنتی ہے تو عمر اور ابوبکر بھی ان سے ہی رجوع کرتے ہیں کبھی عمر کا اور علیؑ کا آمنا سامنا ہو جاتا ہے تو عمر آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتے ہیں ما ابقانی اللہ بعدك یا علیؑ تیرے مرنے کے بعد ہم کو اے علیؑ اللہ جیتا نہ رکھے کیونکہ ہم لوگوں کی زندگانی کی حلاوت تیرے دم سے ہے، اعرابی علیؑ کا نام سنکر کھل کھلایا اور حضرت مولا علیؑ کے آستانہ پر حاضر ہوا اور اپنی رام کہانی سنائی

حضرت علی مرتضیٰؑ، گھبراؤ نہیں تمہارے بارہ میں رسول پاکؐ مجھے وصیت فرما گئے ہیں بولو اونٹوں کا مول لینا چاہتے ہو یا اونٹ جو تم کہو وہ میں دوں،

اعرابی، مجھے تو آپ میرے اونٹ ہی دلوا دیجئے مگر شرط یہی ہے کہ وہی اونٹ ہوں،

حضرت علی مرتضیٰؑ، وہی اونٹ تم پہچان لینا اچھا سلمانؓ تم مدینہ میں ڈھنڈورا پٹوا دو کہ کل صبح کی نماز کے بعد شہر سے باہر مشرق کی طرف جو ریت کا ٹیلہ ہے وہاں سب زن و مرد حاضر ہوں اور اپنے رسولؐ کا ایک نرالا معجزہ دیکھیں کہ اعرابی کی امانت اعرابی کو کیونکر سونپی جاتی ہے، چنانچہ سلمان فارسیؓ نے ڈھنڈورا پٹوا دیا رات گئی اور صبح اپنی دلفریبی کے ساتھ نور کے پھول برساتی کلی کی طرح کھل کھلاتی مشرق کے دریچہ سے نکلی رسول اللہ کے نام پر جان دینے والے کیا مرد کیا عورت کیا جوان کیا بوڑھے کیا لڑکے کیا بچے صبح سے بھی پہلے ریت کے ٹیلوں کے چاروں طرف جمع ہو گئے اصحاب کبار اور اعرابی حضرت علیؑ کے ساتھ ساتھ صبح کی نماز پڑھ کر پشتہ کے پاس پہنچے اور جناب شیر اللہ نے دوگانہ نفل ادا کیا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کی دعا کے ساتھ لوگوں نے دیکھا کہ ریت کے ٹیلہ کو جنبش ہوئی اور اسکی ریت اڑی اور جس طرح انڈے کا چھلکا پھٹ جاتا ہے اور انڈے میں سے مرغی کے بچے نکل آتے ہیں اسیطرح سو اونٹ پشتے میں سے لال اون کے نکل پڑے اعرابی نے ایک خوشی کا نعرہ مار کر کہا واللہ یہ میرے وہی اونٹ ہیں جو حضورؐ مجھ سے لائے تھے اہل مدینہ نے اس معجزہ کو دیکھکر کہا علی مرتضیٰ بے شک رسول خدا کے وصی ہیں اور آپ کے سینہ میں بے شمار اسرار اور بھید بھرے ہوئے ہیں، اعرابی قدمبوسی کے بعد اپنی امانت لیکر اپنے قبیلہ کو روانہ ہوا،

فکاہیات

جنس لطیف اور اُس کی کشش

پرانے لوگ سادے تھے اور بالکل سادے جاتے تھے کہہ گئے الجنس یمیل الی الجنس (ہر جنس اپنی جنس کی طرف جھک جاتی ہے) غلط بالکل غلط، میں بھی اسی مسئلہ کا معتقد تھا مگر اب اپنی غلطی پر نادم ہوں اور سخت نادم ہوں دنیا جانتی ہے کہ لطافت کی ضد کثافت ہے جیسے لاغری کی ضد فربہی، جنس لطیف (لاغر و نازک) کون ہے؟ عورت عورت کی ضد کون ہے؟ مرد، مرد کیا ٹھہرا؟ جنس کثیف و فربہ، لہٰذا منطق کی کلیات خمسہ اور اشکال چہارگانہ نیز فلسفہ قدیم اور اسکے مقولات عشرہ کی بنا پر کبھی مرد کو عورت کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھنا چاہئے مگر مرد عورت پر اس طرح گرتا ہے جیسے نیوٹن کا دیکھا سیب زمین پر لہٰذا معلوم ہوا کہ کلیہ مذکورہ غلط ہے اور اجتماع ضدین یا اتحاد متقابلین کے محال ہونے کا دعویٰ بھی غلط ہے غلط ان کو مجھ سے وہ محبت نہیں ہوسکتی جو ایک ثقلین کو عورت سے واقع ہوتی ہے برہمن کی نظر میں گئو ماتا کی وہ عظمت نہیں جو ایک لیلیائے فرنگ کے قلب میں صنف نازک کے لئے ہے،

داڑھی اور مونچھ کے مسئلے پر میں نے بہت غور کیا اور سوچتا رہا کہ آخر تعلیم کا استرا اس پر کیوں تیز ہے بعد غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک فلسفی دماغ کسی ذلت کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اسکے کسی عمل سے منطق یا فلسفہ کے کسی قاعدے کا انہدام لازم آئے لہٰذا تشابہت پیدا کرکے اصول میلان جنسی کی تصحیح کی کیجاتی ہے لیکن اسپر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ داڑھی اور مونچھ کا نام مرد نہیں اسیطرح ان کے نہ ہونے سے مرد عورت نہیں بن سکتا اگر ایسا ہو تو چین میں سب عورتیں ہی ہونگی لہٰذا بہت سے تشابہ داڑھی اور مونچھ کی صفائی ایک بیکار عمل ہے، ان اس عمل سے مرد اس جماعت میں داخل ہو سکتا ہے جو عورت اور مرد کے درمیان برزخ واقع ہوئی ہے اس سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتا،

حضرات قدامت پسند بھی "عورت" کے دام میں اسیطرح الجھے ہوئے ہیں جس طرح متجددین، فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر صرف گھر کی چار دیواری میں خلوت پسند کرتے ہیں اور موخر الذکر کوچہ میں گلی میں بازار میں پارک میں خلوت میں جلوت میں اندھیرے میں اجالے میں کمرے میں باورچیخانے میں غرض کوئی سا خانہ ہو اور کوئی سا مقام بغیر عورت کے انکے دل نہیں لگتا، کیونکہ آجکل کے اہل قلم کی اصطلاح میں موسیقی حیات کا نغمہ "عورت" ہے ہی عبارت ہے،

اور اس کی دلکش آواز پر ایک قنوط قلب اسیطرح وجد میں آتا ہے جیسے سپیرے کی بین پر سانپ،

وہ حضرات جو "جنس لطیف" کو سر بازار لانا چاہتے ہیں اور تعلیم و تربیت و صحت وغیرہ کا عذر درمیان میں لاتے ہیں اصل میں وہ اپنے خیالات کی غلط ترجمانی کرتے ہیں بات وہی ہے جسے "عاقلان خوب می دانند" اگر صاف کہدیں کہ ہمارا دل نہیں مانتا تو ہرج ہی کیا ہے،

پرانے نیم وحشی لوگ کہتے ہیں کہ پردہ "عورت" کا محافظ ہے لیکن مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں دلیل یہ کہ اہل عرب کی حفاظت بیشک عرب ہی ہو سکتی ہے اور دوم یہ کہ "حفاظت" کے معنے کیا ہیں؟ وہی دقیانوسی مفہوم "تحفظ عفت و عصمت" اگر یہ سال خوردہ لوگ نہیں سمجھتے کہ "عفت" کسے کہتے ہیں اور بدعفتی کیا ہے؟ سنئے؟ اگر جنس لطیف کا دل کہیں اٹک جائے درآن حالیکہ شوہر کو اس کی اطلاع ہو تو بیشک یہ بدعفتی ہے لیکن اگر شوہر کے علم میں یہ افعال واقع ہوں تو کون بیوقوف اس کو عدم عفت سے تعبیر کر سکتا ہے دو دوستوں میں اگر تبادلہ خیالات ہو تو ممدوح لیکن تبادلہ زوجہ ہو تو معیوب آخر کونسے قاعدے سے،

عطائے خطاب

عالیجناب محترم حکیم سید فضل علی صاحب عرف حکیم مرزا صاحب لکھنوی سرپرست دواخانہ معدن الادویہ کو گورنمنٹ کی طرف سے خطاب "شفاء الملک" اعطا ہوا ہے،

حکیم صاحب ممدوح کی قابلیت فن مسلم الثبوت ہے اور اس فن شریف کا جو لازمہ ہے یعنے حسن اخلاق اسکی مثال تو شاذ و نادر ہی ملیگی بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس بارہ میں آپ کا خاندان ایک امتیاز تام رکھتا ہے حکیم صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر مجمع اور ہر سوسائٹی میں ان کے لئے مسند عزت موجود ہے میں ذاتی تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ فطرۃً وہ ہر شخص دوسرے انسان کے بہی خواہ واقع ہوئے ہیں افراد قومی کی بہبودی پر انکی ہمیشہ نظر رہتی ہے اتقا اور تدین انکے خاص جوہر ہیں جب ہمیں نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی تو واقعاً مجھے اس امر پر مسرت ہوئی تھی کہ شیعہ کمیونٹی کے لائق و فائق اطبا بھی گورنمنٹ کی نظر میں آگئے اور پہلے ہی پہل جو حکیم صاحب ممدوح کا انتخاب ہوا وہ ہر طرح موزون ہی موزون ہے،

جن لوگوں کی نظر وحدتِ جامعہ ملیہ پر ہے وہ تو ایک فرد کی عزت کو تمامی ملت کی عزت سمجھتے ہیں اور اس عزت فرد کے آثار اپنی طرف منتقل ہوتے مشاہدہ کرتے ہیں پس حکیم صاحب کو جو عزت ملی ہے فی الحقیقۃ ہر فرد قوم بحیثیت اجتماعی اس عزت میں شریک ہے اور یہی ہماری مسرت کا ماخذ ہے پس یہ تو ایک حقیقت ہے جو بیان ہوگئی اب رہی پابندی رسوم یہ بھی امر ناگزیر ہے لہٰذا عرفان کی طرف سے بھی تبریک و تہنیت کا ایک گلدستہ پیش کش کر دیا جاتا ہے امید ہے جناب موصوف اسے قبول ہی فرمالیں گے،

پندرہ روپیہ روزانہ کمالو: پانچ روپیہ ماہوار کمانا ہو تو ہم سے جدید طریقہ پر صابون بنانا سیکھ لو جس میں بجائے للاب کے صرف ۵ روپیہ گلیسرین پیرسوپ کیک اسٹک بنانیکا تیل کا بھی نقشہ مگر اسپرٹ مہر دھیل پتی کندہ کرانے کی اجرت تین روپیہ علاوہ ہوگی صابون کی تراکیب اور سانچہ کے ہمراہ اقرار نامہ بھی ہم روانہ کر دینگے جس پر لکھا ہوا ہوگا کہ ہم بذریعہ تحریر انگریزی یہی تمام قسم کے مروجہ ۴۶ صابون بنانا سکھا سکتے یا اس میں دگنا منافع نہوا یا ایکدن میں ۳۰ روپیہ کا مال تیار نہو سکا یا ہمارا مرسلہ سانچے میں ایک دن سے ۳ اونس کم وزن کی ٹکیہ نہ بن سکی تو ہم سے یہ جنا پانسو روپیہ ہرجانہ بذریعہ عدالت وصول کرنیکا حق رکھتے ہیں تحریر لکھکر کہ سند دینگے

ناظرین! دھوکے کے واسطے تو شاید آپ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا نہیں مگر پانسو روپیہ کے واسطے تو ہر شخص عدالت میں جا سکتا ہے مگر ہم آپکو یقین دلاتے ہیں کہ آپکو ہرگز عدالت میں جانیکی ضرورت نہوگی اور آپکو ثابت ہو جائیگا کہ ہم سے بہتر کوئی صابن سازی نہیں سکھا سکتا

کیونکہ ہم صابن سازی کے ساتھ کپڑے دھونیکا واشنگ سوڈا کرسٹل سوڈا کلورین کیس بلیچنگ پاؤڈر اور سوڈا کاسٹک بھی بنانا سکھاتے ہیں جب آپ ہم سے ۴۶ قسم کا صابن بنانا سیکھیں گے تو اسکے ساتھ ہی آپکو مذکورہ بالا اشیا کے بنانے کی تراکیب بھی مفت ارسال ہونگی ہم ایک روپیہ میں ۱۲ سیر ۶ سیر ۴ سیر تک صابن بنانا سکھاتے ہیں بغیر چربی کے بغیر بھی چولہے پر بغیر کاسٹک سوڈے کے ٹھنڈے طریقے سے گرم طریقے سے غرضیکہ تمام قسم کی صابن سازی آپکو سکھائی جائیگی اس میں شک نہیں کہ پندرہ روپیہ غربا کے واسطے زیادہ ہے مگر ہم اقرار نامہ دیتے ہیں کہ آپ ایک ہی دن میں ۱۵ روپیہ کما کر معلوم کر لینگے کہ ہم نے ۱۵ روپیہ فیس برائے نام رکھی ہے ہمارے پاس سینکڑوں سرٹیفکیٹ موجود ہیں جنہوں نے قرض لیکر کام شروع کیا اور آٹھ دن بعد وہ فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے اسلئے ہمت کرکے صابن سازی سیکھ لیجئے اس سے کم سرمایہ کا کوئی روزگار نہیں ہے خود پہلے روپیہ وصول ہوئے بغیر تعمیل نہوگی اسلئے درخواست کے ہمراہ پانچ روپیہ ضرور ارسال فرمائیں

المشتہر منیجر رسالہ دستکاری بلیماران دہلی

ریویو

دستکاری - یہ ایک ماہواری رسالہ ہے جو جناب ڈاکٹر شفیع احمد صاحب پی ایچ ڈی کی صدارت میں دہلی محلہ بلیماران سے شائع ہوتا ہے یہ رسالہ سترہ برس سے جاری ہے اور جناب مدیر چونکہ خود فنون صنعت و حرفت میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں اسلئے اس رسالہ کی تحریریں البتہ مستند ہو سکتی ہیں اور یہ بھی فائدہ مقصود ہے کہ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو جناب مدیر یقیناً اسکی رہنمائی کے لئے تیار رہیں گے۔ ہندوستان جیسے ملک کیلئے جو صنعت و حرفت کے میدان میں تمام دنیا سے پیچھے ہے اور جس کا کروڑوں روپیہ ہر سال دوسرے ملک کے صناعوں کی جیب میں پہنچتا ہے یہ رسالہ یقیناً لائق اور قابل قدر ہے کوئی شک نہیں کہ اسکی ہدایات پر عمل کرنے سے ایک معمولی لکھا پڑھا آدمی تھوڑے قلیل سرمایہ کے ساتھ اپنی گذر اوقات کر سکتا ہے اور تعلیمیافتہ بیکار اسکی طرف خاص توجہ کریں

مسلط ہو جاتے ہیں اور ایسا عابد بسا اوقات ذات و صفات الہی کے بارے میں اعتقادات ناسدہ کفر و زنادقہ کو دل میں جگہ دیتا ہے اور ان توہمات کو نعوذ باللہ صحیح سمجھتا ہے اس پر طرہ یہ کہ ایسا عابد اپنی عبادت پر مغرور رہتا ہے تمام لوگوں کو بچشم حقارت دیکھتا ہے اپنے آپکو کامل اور دوسروں کو ناقص سمجھتا ہے امراض نفسانیہ میں مبتلا ہوتا ہے مگر ان کے معالجہ کی توفیق نہیں ہوتی وہ رذائل کو فضائل سمجھتا ہے اور فضائل کو رذائل، بے غیرتی کا نام اس کے پاس حلم ہے، اور تہور کا نام شجاعت و علے ہذا، اس کی عمر اسی رنگ کی عبادت میں گذر جاتی ہے آخر ملک الموت کا پنجہ اس کی گردن پکڑتا ہے، خداوند عالم خبر دیتا ہے، ھل انبئکم بالاخسرین اعمالاً الذین ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا آیا تمہیں ایسے لوگوں کی خبر دیں جن کے اعمال نہایت خسارے میں ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی تمام کوششیں جو زندگانی دنیا میں کی تھیں ضائع ہو گئیں، حالانکہ ان کا گمان تھا کہ ان کا طریقہ عمل بہت ہی بہتر ہے، حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ ارشاد فرماتے ہیں، قصم ظھری رجلان عالم متھتک وجاھل متنسک دو شخصوں نے میری کمر توڑ دی ایک وہ عالم جو (شریعت الہی کی) ہتک کرتا ہے (یا اسرار کو فاش کرتا ہے جو عوام کے سامنے بیان کرنے کے قابل نہیں ہیں) اور دوسرا وہ جاہل جو عبادت گذار بنتا ہے،

اگر انسان غور سے نظر کرے تو اکثر طوائف صوفیہ اسی میں مبتلا نظر آئیں گے، عوام تو عوام ہی ہیں مگر جو خاص ہیں یا خاص کہلاتے ہیں ان کو بھی علم و بصیرت سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ کمال تصوف کی شرط اول جہالت ہے، صدر اسلام سے لے کر آج تک جتنے مفاسد اسلام پر وارد ہوئے ہیں ان میں کا بیشتر حصہ انہیں جاہل عباد و زہاد کی توجہ کا رہین منت ہے اللھم احفظنا من شرور انفسنا

باب استعمال العلم

اس باب میں علم کو استعمال کرنے اور عمل میں لانے کا بیان ہے

الحدیث الاوّل محمد بن یحییٰ عن احمد بن محمّد بن عیسیٰ عن حماد بن عیسے عن عمر بن محمد بن عبدالرحمن بن اُذینہ عن ابان بن ابی عیاش عن سلیم بن قیس الھلالی قال سمعت امیرالمومنینؑ یحدث عن النبیؐ انّہ قال فی کلام لہ العلماء رجلان رجل عالمٌ اخذ بعلمہ فھذا ناجٍ وعالم تارکٌ بعلمہ ھالکٌ وان اھل النّار لیتاذون عن ریح العالم التارک لعلمہ وان اشد الناس ندامۃ وحسرۃً رجل دعا عبداً الی اللہ فاستجاب لہ وقبل منہ فاطاع اللہ فادخلہ الجنّۃ وادخل الداعی الی النّار بترک علمہ واتباعہ الھویٰ وطول الامل امّا اتباع الھویٰ فیصدّ عن الحق وطول الامل ینسی الآخرۃ

سلیم بن قیس ہلالی کہتے ہیں کہ میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے سنا کہ جناب رسول صلی اللہ نے حضرت امیرالمومنین سے فرمایا کہ عالم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ عالم جو اپنے علم پر عمل کرے، ایسا عالم ناجی ہے، اور ایک وہ عالم جو اپنے علم کا تارک ہو ایسا عالم ہالک ہے اور ایسے تارک العلم عالم کی بدبو سے اہل جہنم متاذی ہوں گے، بلاشک کہ اس شخص کی ندامت اور حسرت سب سے بڑھکر ہے جس نے کسی کو اللہ کی طرف بلایا اس نے قبول کیا، اللہ کی اطاعت کی اور اللہ نے اُسے جنت میں داخل کر دیا لیکن اس بلانے والے کو خود تارک علم ہونے اور ہوا و ہوس کی متابعت اور طول امل کے سبب سے دوزخ میں بھیجدیا، واضح ہو کہ ہوا و ہوس کی متابعت حق سے روکتی ہے اور طول امل میں اُلجھکر آخرت کو فراموش کرتا ہے (یہ حدیث ضعیف ہے)

علی المشہور علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک معتبر ہے)

واضح ہو کہ علم کی دو قسمیں ہیں حقیقی و غیر حقیقی پس علمائے غیر حقیقی کے علوم کا ماحصل تو صرف یہ ہے کہ اقوال مشہورہ کو حفظ کریں احادیث و روایات کو منضبط کریں، مقدمات جدل میں ماہر ہوں، ابحاث کلامیہ میں طاق ہوں، مجادلہ پر قادر ہوں، اور بس، مگر یہ تمام امور علوم حقیقیہ سے کوئی ربط نہیں رکھتے، اور علم حقیقی سے فی الحقیقۃ وہ نور مراد ہے جسے خداوند عالم مومن کے دل میں القا کرتا ہے اور قرآن میں اسے مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے، مثلاً حکمۃ - ھدیٰ، فضل، نور وغیرہ پس وہ قلب جو اس علم کی منزل ہے اور جو بندہ اس علم سے متصف ہوتا ہے اسے ہلاکت سے کوئی تعلق نہیں، وہ لامحالہ ناجی ہی ہوتا ہے کیونکہ جہاں کوئی لغزش اس سے صادر ہوئی وہ فوراً استغفار کرتا ہے، خدا کے سامنے ہمیشہ متضرع، عالم آخرت کا شائق اور کمال شائق احق کی طرف راجع، یہ ایسے عالم کی شان ہے پس حدیث بالا میں ایسے علما کا ذکر نہیں ہے بلکہ علمائے رسمی کی طرف اشارہ ہے اور ورا قعہ یہ ہے کہ عالم رسمی کا مقصد طلب علم سے اگر طلب آخرت ہو تو ناجی ہے اور اگر طلب شہرت و جاہ و مال و اعزاز دنیوی اُس کا مقصد ہے تو بالیقین ہالک، اس سے معلوم ہوا کہ عالم دو قسم کے ہیں، علمائے آخرت و علمائے دُنیا، اول الذکر ناجی ہیں، اور آخر الذکر ہالک، اور ان کا عذاب بھی ایسا سخت عذاب ہے جو اہل جہنم کے لئے بھی باعث عبرت ہوگا،

انسان کا ایک زبردست ذریعہ یہ بھی ہے کہ وہ علمائے دُنیا اور علمائے آخرت کو پہچانے اور ان کی معرفت حاصل کرے اور احادیث و اخبار میں جو کچھ وارد ہوا ہے، ان میں ایک یہی حدیث ہے، اور اس کے بعد بھی حدیثیں بیان ہوں گی، اور کچھ ایسی ہیں جو دیگر کتب مشہورہ میں نقل ہوئی ہیں، چنانچہ حضرت پیغمبرؐ سے منقول ہے کہ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب اس عالم کے لئے ہے جس کے علم سے اسے خدا نے فائدہ نہ پہونچایا ہو

نیز ارشاد ہوا ہے کہ علم دو قسم کا ہے ایک وہ علم ہے جو فقط زبان پر ہے پس یہ ابن آدم پر حجت ہے اور دوسرے وہ علم جو قلب میں رہتا ہے، اور یہی علم نافع ہے، نیز فرمایا کہ آخری زمانے میں جاہل عابد اور فاسق عالم ظاہر ہوں گے، نیز فرمایا کہ جس کا علم بڑھ جائے اور ہدایت میں زیادتی نہ ہو تو وہ خدا سے دور ہی ہوتا چلا جائے گا،

اُسامہ بن زید سے منقول ہے کہ میں نے حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ حضرت فرماتے تھے کہ ایک عالم کو لایا جائے گا اور جہنم میں ڈالا جائے گا، وہ جہنم میں اس طرح گردش کرے گا جیسے گدھا چکی کے گرد، اہل جہنم اس کے گرد جمع ہو کر پوچھیں گے، کہ تجھے کیا ہو گیا وہ کہے گا، کہ میں نیکی کا حکم دیتا تھا اور خود اُسے بجا نہ لاتا تھا، شرارت سے روکتا تھا اور خود اُس پر عامل تھا،

عالم بے عمل کا عذاب جو باعث عبرت اہل دوزخ ہے، اور اہل جہنم اس کی بدبو سے متاذی ہوتے ہیں اُس کا سبب عقلی یہ ہے کہ علوم فکریہ اور ریاضات ادبیہ کی مزاولت نفس انسانی کے لئے ایک زبردست محرک ہے اور جو کچھ صفات و اخلاق اُس میں پوشیدہ ہوتے ہیں خواہ وہ نیک ہوں یا بد سب کے سب ظاہر ہو جاتے ہیں، پس نفس جب قوی ہوتا ہے اور عالم قوت سے عالم فعل میں آ جاتا ہے، تو اُس کے احساسات و ادراکات بھی پورے کمال پر ہوتے ہیں، اسی بنا پر ملائم طبع اشیا کے فوت ہونے پر اس کی حسرت نہائت قوی اور تکلیف دہ ہوتی ہے، اور اسیطرح موذیات کے ادراک سے اُسے ایسی اذیت ہوتی ہے جو نفوس ناقصہ میں کبھی متصور نہیں ہوتی، اسلئے کہ یہ نفوس ناقصہ یعنے عوام الناس بسبب قصور جوہریت و طبیعت کسی شے سے وہ اثر نہیں لے سکتے جو ایک نفس کامل لیا کرتا ہے، پس ان کا عذاب بھی عذابِ شدید نہیں ہوتا، اور ان کا ثواب بھی اسی نسبت سے ہوا کرتا ہے، برخلاف ازیں جس طرح عالم کا ثواب (بوجہ تکمیل نفس) المضاعف ہوا کرتا ہے، اسیطرح اس کے عذاب کی بھی یہی شان ہوگی،

الحدیث الثانی محمد بن یحیی عن احمد بن محمد عن محمد بن سنان عن اسمٰعیل بن جابر عن ابی عبد اللہ قال العلم مقرون الی العمل فمن علم عمل ومن عمل علم والعلم یهتف بالعمل فان اجابه والا ارتحل عنه

حضرت ابو عبد اللہ علیہ السلام سے منقول ہے کہ علم عمل کے ساتھ مقرون ہے، پس جو عالم ہے وہ عمل کرتا ہے اور جو عمل کرتا ہے وہ عالم ہو جاتا ہے، اور علم عمل کو پکارتا ہے، اگر اس نے قبول کر لیا تو خیر ورنہ وہ بھی کوچ کر جاتا ہے (یہ حدیث ضعیف ہے علی المشہور)

معلوم ہے کہ علم و عمل کی مثال روح اور بدن کی سی ہے، دونو ایک دوسرے کے مصاحب ہیں اور ایک دوسرے سے تکمیل پاتے ہیں اور علم کا ہر مرتبہ اپنی شان کے موافق عمل کا طالب ہوتا ہے اور ہر عمل کی بدولت ایک نئی حالت اور شان علمی کا ظہور ہوتا ہے مگر یہ سلسلہ اس وقت ہے جبکہ نیت صحیح ہو اور عمل خالص اور فقرہ آخر سے یہ مراد ہے کہ جب مقتضائے علمی کے موافق عمل کا ظہور ہوتا ہے تو اس سے علم کو تقویت پہنچتی ہے اور اس میں ترقی ہوتی ہے اور اگر حسب اقتضا علم عمل نہو تو وہ محو ہو جاتا ہے متروک ہو جاتا ہے حتی اینکہ بالکلیہ زائل ہو جاتا ہے،

الحدیث الثالث عدۃ من اصحابنا عن احمد بن محمد بن خالد بن علی بن محمد القاسانی عمن ذکرہ عن عبد اللہ ابن قسم الجعفری عن ابی عبد اللہ قال ان العالم اذا لم یعمل بعلمه زلت موعظته عن القلوب کما یزل المطر عن الصفا

حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب کوئی عالم اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو اس کی نصیحت کا اثر قلب سے اس طرح پھسل جاتا ہے جیسے چکنے پتھر پر سے پانی کا قطرہ، (ضعیف ہے علی المشہور)

مطلب اس کا صاف ظاہر ہے یعنی عالم بے عمل کے کلام میں تاثیر نہیں ہوتی، اور واز

اس کا یہ ہے کہ کلام کی جیسی ابتدا ہو گی ویسی ہی انتہا بھی ہونی چاہیے، پس اگر یہ کلام دل سے نکلا ہے تو دل تک اس کی رسائی بھی ہو گی، اور اگر زبان سے اس کی ابتدا ہوئی ہے تو پھر کانوں تک ہی اس کا گذر ہو گا، اور بس اس لئے کہ روح پر روح کا اثر پڑتا ہے اور جسم پر جسم کا،

الحدیث الرابع علی بن ابراهیم عن القسم بن محمد عن المنقری عن علی بن هاشم بن البرید عن ابیه قال جاء رجل الی علی بن الحسین علیهما السلام فسئله عن مسائل فاجاب ثم عاد لیسئل عن مثلها فقال علی بن الحسین علیهما السلام مکتوب فی الانجیل لا تطلبوا علوما لا تعلمون ولمّا تعملوا بما علمتم فانّ العلم اذا لم یعمل به لم یزدد صاحبه الا کفرا ولم یزدد من الله الا بعدا

مروی ہے کہ حضرت سجاد علیہ السلام کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا کچھ مسائل پوچھے حضرت نے جواب دیا، اس نے پھر ایسے ہی مسائل کا اعادہ کیا، اسوقت حضرت نے فرمایا کہ انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ جس شے کو تم نہیں جانتے اس کا علم طلب نہ کرو جب تک کہ جن جن باتوں کو جانتے ہو ان پر عمل نہ کر لو، اس واسطے کہ اگر علم پر عمل نہ کیا جائے تو اس سے صاحب علم کے کفر میں ہی زیادتی ہوتی ہے، اور سوائے دوری خدا اور کسی امر میں اضافہ نہیں ہوتا، (یہ حدیث ضعیف ہے)

مکرر بیان ہو چکا ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم کا تعلق اعمال انسانی سے ہے، اسے علم معاملہ کہتے ہیں اس کا ثمرہ اور اس کی غایت نفس عمل ہے، اور دوسری قسم کا تعلق عمل سے نہیں، اور نہ کوئی عمل یا معاملہ اس سے مقصود ہے، یہ علم محض ہے، یہ معرفت خالصہ ہے اس کی غایت وغرض سوائے انجلائے قلب و ازدیاد بصیرت اور کوئی شے نہیں ہے جیسے کہ ذات وصفات و افعال الٰہی کا علم، اور یہ علم جس قدر زیادہ ہوتا ہے، اسیقدر قلب میں

نورانیت پیدا ہوتی ہے اور بصیرت میں اضافہ، یہی علم ہے جس کے سبب سے انسان دنیا سے مستوحش، حق سے مانوس، عالم آخرت کی طرف راغب اور دار ملکوت کا شائق ہوتا ہے لیکن قسم اول یعنے علم معاملہ بس وہ بقدر ما یحتاج کفایت کرتا ہے، اس کی زیادتی میں کوئی فائدہ نہیں، اس علم کا فائدہ بس اتنا ہی ہے کہ اس کے موافق عمل کیا جائے اور بس اور اگر اس کے موافق عمل نہ کیا جائے تو نفس میں اس کے نقوش قائم ہوتے ہیں اور یہی نقوش انسان کی بصیرت کے لئے حجاب بن جاتے ہیں، اس میں ازدیاد و استغراق سے انسان عالم آخرت کو فراموش کرتا ہے، جانب قدس سے روکتا ہے اور وہ مدت العمر ماسوائے اللہ میں ہی مشغول رہتا ہے، اخلاق رذیہ کے شعبے اسی سے نکلتے ہیں اور نفسانی و قلبی بیماریاں اسی سے پیدا ہوتی ہیں، پس حضرت کے ارشاد میں اسی علم کی طرف اشارہ ہے، کہ اگر اس علم کے ساتھ ساتھ عمل نہ ہو یا یوں کہیئے کہ عمل کی غرض سے یہ علم حاصل نہ کیا جائے، تو پھر سوائے حجاب عن الحق اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اور عجب نہیں کہ العلم حجاب الاکبر جو مشہور ہے اسی کی طرف اشارہ ہو۔

الحدیث الخامس محمّد بن یحییٰ عن احمد بن محمد بن عیسیٰ عن محمد بن سنان عن المفضل بن عمر عن ابی عبد اللہ قال قلت له بما یعرف الناجی قال من کان فعله لقوله موافقاً فاثبت له الشهادة ومن لم یکن فعله لقوله موافقاً فانّما ذالک مستودع

مفضل بن عمر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ ناجی کس چیز سے پہچانا جاتا ہے، فرمایا جس کا فعل اس کے قول کے موافق ہو اس سے اسکی شہادت (اظہار ایمان) ثابت و مستقر ہوتی ہے (اور وہ نجات یافتہ ہے) اور جس کا فعل اس کے قول کے موافق نہ ہو تو اس کا ایمان گویا بطور ودیعت اور مستعار ہے (یہ حدیث ضعیف ہے علی المشہور)

مطلب اس حدیث کا ظاہر ہے یعنے ایسے شخص کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں جس کا قول کچھ ہو اور فعل کچھ، یہی اختلاف قول و فعل ہے جو دلیل نفاق ہے، اور ایسے شخص کی نجات خطرے میں ہے،

الحدیث السادس عدۃ من اصحابنا عن احمد بن خالد عن ابیہ رفعہ قال قال امیر المومنین علیہ السلام فی کلام لہ خطب بہ علی المنبر ایہا الناس اذا علمتم فاعملوا بما علمتم لعلکم تھتدون ان العالم العامل بغیرہ کالجاھل الحائر الذی لا یستفیق عن جھلہ بل قد رایت ان الحجۃ علیہ اعظم والحسرۃ ادوم علی العالم المنسلخ عن علمہ منہا علی ھذا الجاھل المتحیر فی جھلہ وکلاھما حائر بائر لا ترتابوا فتشکوا ولا تشکوا فتکفروا ولا ترخصوا لانفسکم فتدھنوا ولا تدھنوا فی الحق فتخسروا وان من الحق ان تفقھوا ومن الفقہ ان لا تغتروا وان انصحکم لنفسہ اطوعکم لربہ وغشکم لنفسہ اعصاکم لربہ ومن یطع اللہ یامن ویستبشر ومن یعص اللہ یخب ویندم (مرفوع)

بہ سند مرفوع حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت نے بالائے منبر اثنائے خطبہ میں فرمایا کہ ایہا الناس جب تم کسی امر کو جان لو تو اس پر عمل بھی کرو جو تم کو سکھایا گیا ہے تاکہ ہدایت پاؤ، تحقیق کہ جو عالم اپنے علم کے خلاف عمل کرتا ہے وہ اسی جاہل کی مانند ہے جو حیران ہو اور کہیں اُسے راہ نہ ملتی ہو، اور کبھی اُسے اپنے (مرض) جہالت سے افاقہ نہو بلکہ میں نے دیکھا ہے کہ اس عالم پر جو اپنے علم سے کنارہ کشی کرے بہ نسبت اُس جاہل کے جو اپنے جہل میں متحیر ہو حجت قوی و عظیم ہے اور اسکی حسرت پائدار اور دائم تر ہے دونوں کے دونوں حیران ہیں، ہلاک ہیں، تم شبہات میں نہ پڑو ورنہ شکوک میں مبتلا ہوگے اور شک نہ کرو ورنہ کافر ہو جاؤ گے، اپنے نفسوں کو ڈھیل

نہ چھوڑو، ورنہ نفاق میں مبتلا ہو گے، اور حق کے معاملے میں مداہنت اور تساہل سے کام نہ لو ورنہ خسارے میں رہو گے، اور حق یہ ہے کہ تم تفقہ (فی الدین) حاصل کرو اور تفقہ یہ ہے کہ تم مغرور نہ بنو، اور بے شک جو شخص کہ اپنے نفس کے لئے ناصح تر ہے وہی اپنے رب کا مطیع تر ہے، اور جو اپنے نفس کو تاریک تر کرنے والا ہے، وہی اپنے رب کا نافرمان تر ہے اور جو شخص اللہ کا مطیع ہے، وہ امن میں ہے اور مسرور ہے اور جو شخص اللہ کا نافرمان ہے وہ خائب و خاسر اور نادم ہے"

اس حدیث مقدس میں عالم بے عمل اور جاہل کو ایک درجہ میں رکھتے ہوئے عالم کی حسرت و ندامت اور حجت الٰہی کو اس پر قوی تر بتایا گیا ہے جو بالکل ایک محسوس اور بدیہی چیز ہے، اس لئے کہ کسی چیز کے فوت ہونے کی حسرت کو وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس کی لذت سے آشنا بھی ہو، بادشاہت کے لٹ جانے کی حسرت بادشاہ کے قلب سے پوچھ یا اس سے جو مدارج شاہی سے آشنا ہے، ایک فقیر جاہل کو اس سے کیا؟ اسی طرح عالم جو ان مدارج کا آشنا ہے، جنت صوری و معنوی سے خبردار ہے اور پھر اس کی طرف سے غافل تو بالیقین حجاب اٹھ جانے پر اس کی حسرت بہ نسبت جاہل کے بہت قوی ہو گی، اور اسی طرح حجت الٰہی بھی اس پر قوی ہے، جاہل کے لئے عذر جہالت موجود ہے لیکن عالم کے لئے تو یہ بھی نہیں،

آخر کلام میں حضرت نے اس سلسلہ کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ شبہات سے شکوک بڑھتے ہیں اور شکوک سے کفر پیدا ہوتا ہے، یعنی شبہ جب ترقی کر جائے، تو شک بن جاتا ہے اور یہی شک جب ترقی پذیر ہو تو کفر میں تبدیل ہو جاتا ہے،

الحدیث السابع عشر من اصحابنا عن احمد بن محمد بن خالد عن بعض عمن ذکرہ عن محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلی الانصاری قال سمعت ابا جعفرؑ یقول اذا سمعتم العلم فاستعملوہ ولیتسع قلوبکم فان العلم

اذا کثر فی قلب رجل لا یحتمله قدر الشیطان علیه فاذا خاصمکم الشیطان فاقبلوا علیه بما تعرفون فان کید الشیطان کان ضعیفا فقلت وما الذی نعرفه قال خاصموه بما ظهر لکم من قدرة الله (ضعیف)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تم علم کو سن لو تو اُس پر عمل بھی کرو، اور سعی کرو، کہ تمہارے قلوب وسیع ہو جائیں اس لئے کہ علم جب کسی شخص کے قلب میں کثرت سے ہو جاتا ہے جس کی وہ برداشت نہیں کر سکتا، تو شیطان اسپر قابو پا لیتا ہے پس جبکہ شیطان تم سے مخاصمہ کرے تو اس سے اپنے علم و معرفت کی بناء پر مقابلہ کرو، اس لئے کہ شیطان کا مکر ضعیف ہوتا ہے، راوی نے عرض کیا، کہ کس قسم کی معرفت سے اس کا مقابلہ کریں، فرمایا اللہ کی قدرت جو تمہارے لئے ظاہر ہوتی ہے، اُسی کے ساتھ مخاصمہ کرو۔ اتساع و فراخی قلوب سے یہ مراد ہے کہ علم (عملیات) کی اتنی کثرت نہ ہو کہ تمہارے قلوب تنگ ہو جائیں، اور اُسے برداشت نہ کر سکیں، جیسا کہ اصحاب تصوف اور ارباب احوال نے اپنے مریدوں کو نصیحت کی ہے کہ تم حال پر حاکم بنو نہ یہ کہ حال تم پر حکومت کرے اور ہم اکثر صاحبان علم کو دیکھتے ہیں جو بہت سے فضائل و خیرات کا مذاکرہ تو کرتے ہیں لیکن تلفیق مسائل اور مباحث مسائل کی بدولت خود محاسن اخلاق سے محروم رہتے ہیں گویا ان کے قلوب میں اس کی گنجائش نہیں رہتی، پس لازم ہے کہ انسان کا قلب وسیع ہو اور کثرت علم اسے فعل خیر و طاعات سے مانع نہ ہو اس لئے کہ جب قلب حق کو قبول کرنے سے تنگ اور ضعیف ہو جاتا ہے تو شیطان اُسپر مستولی و متصرف ہوتا ہے، اور وساوس و اغوا کے حملے قلب پر ہوتے ہیں، اور اسی کی طرف اس ارشاد میں اشارہ ہے کہ علم کسی شخص کے قلب میں جب کثیر ہوتا ہے، تو شیطان اُسپر متصرف ہو جاتا ہے پھر چونکہ قائل یہ کہنا چاہتا ہے کہ جب کثرت علم سبب اقتدار شیطان ہے تو ہم کس شے سے شیطان کا مقابلہ کیا جائے، اسی کا جواب حضرت نے فرمایا کہ جب شیطان

ستم سے مخاصمہ کرے، تو اپنی معرفت سے اس کا مقابلہ کرو، یعنے ادنے معرفت ہی شیطان کے رد کرنے کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ شیطان کا کید ضعیف ہے، پھر راوی کے سوال پر کہ وہ کونسی معرفت ہے فرماتے ہیں کہ وہ ادنے معرفت جو شر کید شیطان کو دفع کرنیکے لئے کافی ہے، وہ معرفت ہے جو ادنے تامل سے تمام اشیا پر قدرت خالق کو ظاہر کرتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اس عالم کے پیدائش پر قادر ہے، اُسیطرح عالم آخرت پر بھی قادر ہے، وہ انسانوں کو قبروں میں سے اُٹھانے کی بھی قدرت رکھتا ہے، وہ مطیع کو ثواب اور نافرمان کو عذاب دینے پر قادر ہے، پس اوّلاً اسی قدر معرفت کافی ہے، اور اسی سے انسان فعل طاعات و ترک سیئات پر قادر ہو سکتا ہے، پھر جس قدر عمل بڑھے گا جس قدر سعی ترقی کرے گی اُسیقدر یقین انکشاف اور بصیرت بڑھتے چلے جایئں گے، پس اس سے ظاہر ہوا، کہ کتاب و سنت میں جو علم ممدوح ہے، وہی ہے جو ہر علم و عمل کی غایت ہے، وہ علم نہ کثرت مسائل کا نام ہے نہ ادراکات تصوریہ و تصدیقیہ کا، وہ ایک نور ہے جو ریاضات علمیہ و فکریہ، اخلاص نیت، صدق عمل اور قوتِ تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے،

باب المستاکل بعلمہ والمباھی بہ

اس باب میں علم کو حصولِ دُنیا کا ذریعہ بنانے اور اس کے ساتھ مباہات کرنیکا بیان ہے
الحدیث الاول محمّد بن یحیےٰ عن احمد بن محمّد بن عیسےٰ و علی بن ابراھیم عن ابیہ جمیعاً عن حمّاد بن عیسیٰ عن عمر بن اذینہ عن ابان ابن ابی عیاش عن سلیم بن قیس قال سمعت امیر المومنین یقول قال رسول اللہ منھومان لا یشبعان طالب دنیا و طالب علم فمن

اقتصر من الدنیا علی ما احل اللہ لہ سلم ومن تناولہا من غیر حلہا هلك الا ان یتوب او یراجع ومن اخذ العلم من اہلہ وعمل بعلمہ نجی ومن اراد بہ الدنیا فہی حظہ،

سلیم بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے سُنا، فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا کہ دو بھوکے ہیں جو کبھی سیر نہیں ہوتے، پس جس نے اس دُنیا پر اکتفا کی جو خدا نے اس کے لئے حلال قرار دی ہے، وہ سالم رہا، اور جس نے غیر حلال طریقے سے اُسے لیا وہ ہلاک ہوگیا، الا یہ کہ توبہ کرے یا اس سے رجوع کرے اور جس شخص نے علم کو اہل علم (اہلبیت علیہم السلام) سے لیا اور اپنے علم پر عمل کیا وہ ناجی ہے اور جس نے اس علم سے محض دُنیا مد نظر رکھی، تو بس دُنیا ہی اس کا حصہ ہے (آخرت میں اُس کے لئے کچھ نہیں)

مطلب اس حدیث کا ظاہر ہے، علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں، کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور میرے نزدیک معتبر ہے،

الحدیث الثانی الحسین بن محمد بن عامر عن معلی بن محمد عن الحسن بن علی الوشاء عن احمد بن عائذ عن ابی خدیجہ رسالم بن مکرم) عن ابی عبد اللہ قال من اراد الحدیث لمنفعۃ الدنیا لم یکن لہ فی الاخرۃ من نصیب ومن اراد بہ الاخرۃ اعطاہ اللہ خیر الدنیا والاخرۃ

حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص نفع دنیا کے لئے حدیث (علوم اہلبیت) کو حاصل کرے، تو آخرت میں اس کا کوئی حصّہ نہ ہوگا، اور جو اُس کے ذریعے سے آخرت حاصل کرنا چاہے، تو خداوند عالم اُسے دُنیا و آخرت کی نیکی عطا فرماتا ہے،

علامہ مجلسی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث علی المشہور ضعیف ہے لیکن میرے نزدیک معتبر ہے،

توضیح مطلب یہ ہے کہ شخص مذکور یعنے علم کو دُنیا کے لئے حاصل کرنے والا دین کو

حصول دنیا کا طریقہ قرار دیتا ہے، اعمال دینیہ سے دنیا کا طالب ہوتا ہے، اس کی عقل شہوات کی خادم ہوتی ہے، پس ایسا شخص جس کی انتہائی سعی اور منتہائے قصد و نیت دنیا اور خواہشات دنیا ہوں، جو امور فانیہ باطلہ ہیں، تو آخرت میں سوائے آتش جہنم اس کے لئے کچھ نہ ہوگا، اور یہ بھی جاننا چاہیئے کہ ایسے شخص کا حال تمام طالبان دنیا کی نسبت بدتر ہے، اس لئے کہ وہ لوگ دنیا کو دنیا کے ساتھ طلب کرتے ہیں، اور جسمانیات و محسوسات کو اعضا و حواس کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں اور یہ وہ شخص ہے جو منفعت دُنیا کے لئے حدیث کو حاصل کرتا ہے اور ان امور خسیسہ کثیفہ کو لبّ ذات اور جوہر عقل کے معاوضہ میں خریدتا ہے، پس یہ وہ شخص ہے جو اپنے مادۂ عقلی کو شہوت فانیہ کی صورتوں کے لئے وقف کر دیتا ہے، پس آخرت میں اس کا عذاب بہت دردناک ہوگا، بخلاف دوسرے اہل دُنیا کے جو دو متضاد چیزوں کو جمع نہیں کرتے اور اگر اس شخص نے علوم دینیہ سے آخرت کا قصد کیا، اور آخرت کے لئے سعی کی، تو اس کے نفس میں ایک ملکۂ فاضلہ حاصل ہو جاتا ہے، اس کی ذات صورت آخرت اور صورت علم و عرفان سے مزین ہوتی ہے، آخرت میں ایسا شخص سعید ہوتا ہے اور دنیا میں عزیز و مکرم،

الحدیث الثالث علی بن ابراھیم عن ابیہ عن القسم عن المنقری عن حفص بن غیاث عن ابی عبد اللہ ع قال اذا رأیتم العالم محبّاً لدنیاہ فاتھموہ علی دینکم فان کل محبّ لشیٍ یحوط ما احبّ وقال ع اوحی اللہ الی داؤد لا تجعل بینی وبینک عالماً مفتوناً بالدنیا فیصدّک عن طریق محبتی فانّ اولٰئک قطاع طریق عبادی المریدین ان ادنیٰ ما انا صانع بھم ان انزع حلاوۃ مناجاتی من قلوبھم (ضعیف)

حضرت صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر تم کسی عالم کو دیکھو کہ وہ اپنی دنیا پر

فریفتہ ہے تو تم اپنے دین کے بارے میں اُسے متہم کرو (یہ اعتقاد رکھو کہ وہ اس دین کے بارے میں متہم ہے اور اسے حقیقتِ دین سے کوئی سروکار نہیں) اس لیے کہ جو شخص جس شئے کو دوست رکھتا ہے وہ اُسی کی حفاظت کرتا ہے، نیز فرمایا کہ خداوند عالم نے حضرت داؤد پر وحی کی کہ تو میرے اور اپنے درمیان اُس عالم کو واسطہ نہ بنا، جو دنیا پر مفتون ہے کیونکہ وہ تجھے میری محبت کے رستے سے روکے گا، یہ وہ لوگ جو میرا ارادہ کرنے والے بندوں کے لیے رہزن ہیں، اور اس امر کی ادنےٰ سزا میں انہیں یہ دیتا ہوں کہ اپنی مناجات کی لذت ان کے قلوب سے سلب کر لیتا ہوں،

الحدیث الرابع علی ابن ابراھیم عن النوفلی عن السکونی عن ابی عبداللہ ع قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ والہ الفقھا امناء الرسل مالو یدخلوا فی الدنیا قیل یارسول اللہ وما دخولھم فی الدنیا قال اتباع السلطان فاذا فعلوا ذالك فاحذروھم علےٰ دینکم رضیف،

حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا کہ فقہا رسولوں کے امین ہیں جب تک کہ وہ دنیا میں داخل نہ ہوں، عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ دنیا میں داخل ہونے سے کیا مراد ہے، فرمایا بادشاہ کی اطاعت (اس کی خواہش کے موافق فتوے دینا) پس جب ان سے یہ افعال سرزد ہوں، تو اپنے دین کے بارے میں ان سے حذر کرو، اطاعت بادشاہ سے یہ مراد ہے کہ ان کی جانب سے عہدہ قضا قبول کیا جائے اور برضا و رغبت و اختیار ان کے ساتھ معاشرت کی جائے،

مترجم عرض کرتا ہے کہ اہل دول کی خواہشات کے موافق فتوے دینا بھی اسی میں داخل ہو سکتا ہے،

کہا گیا ہے کہ علما تین قسم کے ہوتے ہیں اول وہ جو اپنے لئے بھی سعید ہوں اور دوسروں کے لئے بھی، دوسرے وہ کہ اپنے آپ کو بھی تباہ کریں اور دوسروں کو بھی تیسرے

وہ کہ اپنے نفس کو ہلاک کریں اور دوسروں کے لئے سبب سعادت ہوں، یہ پہلی قسم کے علماء داعی الی اللہ ہوتے ہیں، ظاہراً و باطناً دنیا سے کنارہ کشی کرتے ہیں، اور دوسرے صریحاً طالب دُنیا اور علانیہ دنیا کی طرف راغب، یہی لوگ اتباع سلاطین و اہل دول ہوتے ہیں اس لئے کہ ثروت و مال جاہ و جلال اور اپنے اقران و امثال پر ترفع بغیر اسکے حاصل نہیں ہوتا، اور تیسرے وہ ہیں جو لوگوں کو آخرت کی دعوت دیتے ہیں، وعظ و پند و امامت ان کا شغل ہوتا ہے، ظاہر میں تارک دنیا ہوتے ہیں، لیکن باطن میں ان کا قصد یہی ہوتا ہے کہ لوگ ان کی طرف راغب ہوں اور بسا اوقات ان کی باطنی خواہشیں انہیں دعوت خلق اور ارشاد و ہدایت سے روکتی ہیں اور انہیں خبر بھی نہیں ہوتی، اور پھر اس ارشاد و ہدایت خلق میں وہ ثواب آخرت کی بھی امید رکھتے ہیں، یہ لوگ گویا شیطان کے مسخرے ہوتے ہیں بس ان کی انتہائی شان یہ ہوتی ہے، کہ خود جلیں اور دوسروں کو روشنی پہنچائیں، (از افادات صدر المتالہین ح)

مترجم عرض کرتا ہے کہ احادیث قدسیہ میں وارد ہوا ہے (لا تکن کالسراج فیحرق نفسہ ویضی غیرہ) چراغ کی مثال نہ بن کہ خود جلتا ہے اور دوسرے کو روشنی پہونچاتا ہے،

الحدیث الخامس محمّد بن اسمٰعیل عن الفضل بن شاذان عن حمّاد بن عیسیٰ عن ربعی بن عبداللہ عمّن حدّثہ عن ابی جعفرؑ قال من طلب العلم لیباھی بہ العلماء او یماری بہ السفھاء او یصرف وجوہ الناس الیہ فلیتبوء مقعدہ من النّار انّ الرّیاسۃ لاتصلح الّا لاھلھا

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص علم کو اس غرض سے طلب کرے کہ علما پر مباہات و تفاخر جتائے یا بیوقوفوں کے ساتھ مجادلہ کرے، یا سربرآوردہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچے تو اُس کا ٹھکانا جہنم ہے اور تحقیق یہ ہے کہ ریاست اُس کے اہل کے

ہی لیے سزاوار ہے،

اغراض نفسانیہ میں سے اس حدیث میں تین خصلتوں کا بیان فرمایا ہے، یعنے افتخار و مباہات، مجادلہ اور جلب مردم کیونکہ علمائے دُنیا نہ عمل کے لیے علم کو حاصل کرتے ہیں اور نہ اِس لیے کہ علم کے ذریعے سے حقیقت کا انکشاف ہو اور تقرب الہٰی میسر ہو بلکہ ان کی غرض انہیں اُموریں سے کسی ایک کے متعلق ہوتی ہے یا کلیتہً یہ اُمور مدنظر ہوتے ہیں کہ یا تو وہ علم کے ذریعے سے علما پر مباہات کریں، یا سفہا کے ساتھ مجادلہ کریں تاکہ عوام الناس میں شہرت ہو کہ فلاں شخص بڑا نطاق ہے بحث میں سب پر غالب آتا ہے اور یا اس غرض سے کہ دنیا کے لوگ ان کی طرف مائل ہوں اسلیے کہ اس میں تمام دُنیوی لذتیں موجود ہیں، اسی لیے حضرت نے تنبیہ کی ہے، کہ امر ریاست بہت خطرناک ہے، اس کی آفتیں بہت عظیم ہیں اور یہ ریاست اُس کے لیے ہی سزاوار ہے، جو اس کا اہل ہو، اور یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں جو قوت علم و عمل میں کامل ہیں (حد مشترک رہین الوجوب والامکان) کے صدرنشین ہیں، حق و خلق کے جامع ہیں انہیں ایک حالت دوسری حالت سے نہیں روکتی، جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے "رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ" یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تجارت اور بیع ذکر الہٰی سے نہیں روکتی، مختصر یہ کہ اہل ریاست وہی ہیں جن کی اطاعت اللہ نے واجب کی ہے جن کی طرف رجوع کا حکم دیا ہے جن سے علوم اخذ کرنے کا فرمان ہے،

صدوق علیہ الرحمۃ نے معانی الاخبار میں باسناد خود عبدالسلام بن صالح ہروی سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت رضا علیہ السلام سے سنا کہ جو شخص ہمارے امر کا احیا کرے خدا اسپر رحم کرے، میں نے عرض کی کہ آپ کے امر کا احیا کیونکر ہو، فرمایا کہ ہمارے علوم کو سیکھے اور لوگوں کو ان کی تعلیم دے، اس لیے کہ لوگ اگر ہمارے محاسن کلام کو جان لیں تو ضرور ہمارا اتباع کریں، میں نے عرض کی یابن رسول اللہ